مادری زبان ذریعہ تعلیم اور بلوچی

ڈاکٹر دین محمد بزدار

بلوچی اکیڈمی
عدالت روڈ کوئٹہ
www.balochiacademy.org

(c) All rights are reserved.

جملہ حقوق بحق بلوچی اکیڈمی محفوظ ہیں

مادری زبان ذریعہ تعلیم اور بلوچی

ڈاکٹر دین محمد بزدار

بارِ اوّل:2010

بارِ دوئم:2026

(نئی ترتیب و اضافوں کے ساتھ)

ISBN # 978-969-680-204-4

قیمت:=/300

بلوچی اکیڈمی نے یہ کتاب میراث پرنٹنگ پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کی۔

Education has the power to transfer people and countries alike, because it is the wellspring of equality, ability, social opportunities, economic stability, and national progress.(UNESCO).

تعلیم ہی وہ طاقت ہے جو افراد اور اقوام کو برابری فراہم کرتی ہے، کیونکہ تعلیم ہی برابری، انسانی استعداد، معاشرتی مواقع، معاشی استحکام اور قومی ترقی کا سرچشمہ ہے۔(یونیسکو)

انتساب

نواب محمد اکبر خان بگٹی کے نام جنھوں نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے بلوچستان میں پہلی بار بلوچی براہوئی اور پشتو زبانوں کو پرائمری تک تعلیمی زبان قرار دے کر رائج کر دیا

فہرست

پیش لفظ vii

تعارف x

حصہ اول 1

بلوچ، بلوچستان اور بلوچی 3

ادبا، شعرا، فنکار اور بلوچی 6

بلوچی زبان، رسم الخط اور املا 9

زبان اور اسکی طاقت 12

بلوچ علماء کرام اور بلوچی زبان 15

قوم پرست اور بلوچی زبان 17

بلوچی زبان اور میڈیا 19

مادری زبانیں اور حکمرانوں کا رویہ 22

مادری زبان میں تعلیم: عالمی تناظر! 26

مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت 30

زبان اور قومی شناخت 34

بلوچی زبان کو معیاری بنانا 36
مادری زبانیں اور یکساں تعلیمی نظام 40
21 فروری مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا دن 43
بلوچی زبان اور ریڈیو پاکستان 47

حصہ دوئم 50

(تراجم) 50

یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر ماٹسورا کا پیغام 52
ریاستی گرفت اور بلوچستان میں زبان پر اس کا اثر (کارینا جاہانی) 54
مادری زبان میں تعلیم، بلوچی زبان کی سلامتی اور بقا (فارل ٹیمو تھی) 73
بلوچی زبان کی سرگزشت (برین اسپونر) 98
کونسی زبان؟ (زبیدہ مصطفیٰ) 120
زبان: اقتدار کی جدوجہد میں ایک خفیہ طاقت (مشتاق صوفی) 124
مسائل کا صحیح حل (زبیدہ مصطفیٰ) 132

پیش لفظ

یونیسکو کی طرف سے 17 نومبر 1999 کو یہ اعلان ہوا کہ 21 فروری کا دن مادری زبانوں کے لئے مختص ہوگی۔ 2008 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہ قرارداد بھی مان لی کہ ہر سال 21 فروری کو مادری زبانوں کے عالمی دن کی مناسبت سے منایا جائے گا۔

2000 سے یونیسکو کے مرکز میں اس دن کو عالمی طور پر منانے کا اہتمام کیا گیا، اسی طرح کے اقدامات 2002 اور 2003 میں بھی کئے گئے۔ 2004 میں بچوں کو اپنی زبان سیکھنے اور ان کے لئے کتابیں چھاپنے کے متعلق زیادہ توجہ دی گئی تاکہ بچے کلاس روم میں اپنی مادری زبان کو پڑھیں اور اپنی زبان میں لکھنا سیکھ سکیں۔

اسی طرح 2005 کو اشاراتی زبان، 2006 کو زبان اور سائبر اسپیس، 2007 کو کئی زبانوں میں تعلیم، 2008 کو زبانوں کے عالمی سال اور، 2010 کو مختلف ثقافتوں وتہذیبوں کے مابین ہم آہنگی کا سال قرار دیا گیا۔ آج جب مادری زبانوں کی اہمیت کو عالمی سطح پر تسلیم کرلیا گیا ہے اس کا کریڈٹ یقیناً ان بنگالی شہداء کو جاتا ہے جن کی قربانیوں کی بدولت یہ عالمی ادارہ اس جانب متوجہ ہوا۔

اس سلسلے میں اقوام متحدہ نے پالیساں تو بنالی ہیں مگر یہ پالیسیاں اُس وقت عملدرآمد کی حد تک پہنچ پائیں گی جب اقوام متحدہ اپنے ممبر ممالک کو واضح ہدایات دے اور اِن پر عمل نہ کرنے کی سزا بھی مقرر کرے۔

اس پالیسی کو نظر انداز کرنے والے ممالک میں پاکستان بھی شامل ہے پاکستان کے آئین میں مادری زبانوں کو بے شک صوبائی سبجیکٹ قرار دیا گیا ہے مگر یہ مرکز کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس معاملے میں صوبوں کو پابند کرے۔

اگر بلوچی زبان کو سرکاری، دفتری تعلیمی زبان بنانے کی کوششوں کی جانب ایک نظر ڈالی جائے تو اس سلسلے بلوچی زبان کے لئے ابتدائی سنجیدہ کوششوں کی ابتداء 1948 سے ہوئی۔ محترم اثیر عبدالقادر شاہوانی تاریخ خوانین قلات (میر احمد یار خان) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"4 جنوری 1948 کو دیوان خاص کے اجلاس منعقدہ ڈھاڈر میں نواب بائی خان گچکی سمیت تمام سردار موجود تھے۔ متفقہ طور پر بلوچی زبان کو حکومت قلات کی سرکاری اور قومی زبان تسلیم کر کے تعلیمی اداروں میں رائج کرنے کی سفارش کی گئی"۔ (روزنامہ جنگ کوئٹہ، میگزین 17 تا 23 فروری 2010)

اس کوشش کے بعد تاریخ کے اوراق میں بلوچی زبان کے لئے سنجیدہ کوشش اس وقت کی گئی جب "استمان گل" کی بنیاد ڈالی گئی۔

16 جولائی 1956 کو جب شہزادہ عبدالکریم اور محمد حسین عنقا جیل سے رہا ہوئے تو اپنی رہائی کے تقریباً ایک مہینے بعد وہ کراچی تشریف لائے جہاں انہوں نے ریاست قلات کے سیاسی کارکنوں کا اجلاس طلب کیا، میر غوث بخش بزنجو، میر گل خان نصیر، شہزادہ عبدالکریم، محمد حسین عنقا اور دوسرے اکابرین نے استمان گل کی بنیاد ڈالی اور تاریخی نسلی، لسانی اور جغرافیائی بنیادوں پر بلوچوں کے لئے ایک وحدت کا مطالبہ کیا اور ساتھ ساتھ بلوچی زبان کو اس وحدت کی سرکاری اور تحریری زبان قرار دینے کا بھی مطالبہ کیا۔ (تاریخ بلوچستان۔ میر گل خان نصیر صفحہ۔338)

جب نواب اکبر خان بگٹی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے عملاً مادری زبانوں کو اہمیت دی اور بلوچستان میں مادری زبانوں میں پڑھنے کی روایت ڈالی مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکی۔ بلوچستان کی تقریباً تمام سیاسی جماعتوں وطلباء تنظیموں کے آئین میں مادری زبانوں کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے مگر یہ سلسلہ صرف آئین کے اغراض ومقاصد کی حد تک محدود ہے جس کا عملی مظاہرہ دیکھنے کی ابھی تک قوم متمنی ہے۔

مادری زبانوں کے عالمی دن کے موقع پر بلوچی اکیڈمی "مادری زبان ذریعہ تعلیم اور بلوچی زبان" کو نذر قارئین کر رہا ہے اس اُمید کے ساتھ کہ اس سے ایک بحث کا اغاز ہو اور مادری زبانوں کو ان کا جائز مقام ملے۔

یہ کتاب محترم ڈاکٹر دین محمد بُزدار کی کاوشوں کا ثمر ہے جس میں ان کی اپنی تحریروں کے ساتھ ساتھ (جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں) کارینا جہانی اور ٹم فیرل کے مضامین کے تراجم بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ

8/فروری 2010

تعارف

اس کتاب کو لکھنے اور ترتیب دینے کا مقصد یہ ہے کہ مادری زبانوں کی اہمیت کو اُجاگر کیا جائے۔ مادری زبانوں کی ضرورت اور اہمیت کا احساس نہ صرف ارباب اقتدار کے دلوں میں نہیں بلکہ خود ان کے بولنے والوں کے ذہنوں میں بھی مبہم ہے، بلوچ باشعور طبقے جیسے سیاسی ورکر، طلبا، دانشور اور ادیبوں کے اذہان میں بھی مادری زبان کی اہمیت واجبی ہے اور سب سے زیادہ پریشان کن حقیقت یہ ہے کہ بلوچ سیاسی رہنماؤں کی توجہ اس طرف نہیں۔ ان طبقات کو زبان کے حق میں متحرک کرنا ہے اور انہیں یہ یقین دلانا ہے کہ بلوچوں کی ترقی اور تشخص بلوچی زبان سے وابستہ ہے، جبکہ بلوچی زبان کی ترقی اور بقا کی ضمانت اسے ذریعہ تعلیم قرار دینے میں مضمر ہے۔ بلوچ قوم کی آبادی بلوچستان کے رقبہ کے لحاظ سے بہت کم اور بکھری ہوئی ہے اور وہ تین ممالک ایران، افغانستان اور پاکستان میں منقسم ہیں، ان ممالک کے حکمرانوں کا رویہ بھی بلوچی زبان کے ساتھ مخاصمانہ ہے۔ اس کے علاوہ بلوچی نہ تو کسی صوبے کی دفتری اور سرکاری زبان ہے اور نہ اسکا کوئی ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی چینل ہے۔ مزید یہ کہ بلوچی لکھنے اور پڑھنے والے بہت کم ہیں اس لئے اخبارات اور جرائد کا اجرا کامیاب نہیں رہتا۔ بلوچوں کی اپنی کوئی معاشی مارکیٹ نہیں ہے، یہاں تک کہ بلوچستان کے جو بڑے شہر ہیں مثلاً کوئٹہ، زاہدان، ڈیرہ غازیخان اور خان گڑھ وغیرہ، وہاں پر بھی دوسری زبانوں

کا غلبہ ہے ،بلوچ ان علاقوں (جہاں غیر زبانیں بولی جاتی ہیں اور انہیں سرکاری سرپرستی حاصل ہے) کی غیر اقوام کی مارکیٹ کی زبانوں پر انحصار کرتے ہیں، اس لئے ہمسایہ زبانیں جیسے فارسی، پشتو، سندھی، سرائیکی، بلوچی کو تیزی سے چاٹ (Erode) رہی ہیں لہذا بلوچی کے معدوم ہونے کا خطرہ سب سے زیادہ ہے۔ تقریباً بیس سال پہلے ہم چند دوست لنڈ گاؤں (جو ڈیرہ غازیخان اور تونسہ کے درمیان روڈ پر واقع ہے، گئے) وہاں سے علاقہ موہوئی (وندر کے پہاڑی علاقہ جاناتھا) گرمی میں پیدل چلنا مشکل تھا اس لئے اونٹوں پر جانے کا فیصلہ ہوا۔ نزدیک جتوں کی بستی گئے جہاں بستی والے بلوچی کے ساتھ سرائیکی ملا کر ایک نئی زبان بول رہے تھے میرے پوچھنے پر کہ آپ کونسی زبان بول رہے ہیں؟ وہ ہنسے اور کہنے لگے ہم بلوچ ہیں اور بلوچی بول رہے ہیں۔ نہیں معلوم اب بھی وہ وہی زبان بول رہے ہیں یا سرائیکی؟

اس کتاب کو ضبط تحریر میں لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ ملکی آئین میں صوبوں کے عوام کو مادری زبان میں تعلیم کا حق حاصل ہے اور سندھ یہ حق استعمال بھی کر رہا ہے، یہ بلوچستان کی صوبائی حکومت ہے جو اس پر عمل درآمد نہیں کر پا رہی۔ بعض حلقوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ مرکزی حکومت اسکی ذمہ دار ہے وہ اپنے اخباری بیانات اور تقاریر میں اکثر یہی شکایت کرتے ہیں۔

اس کتاب میں بلوچی زبان کے بارے ماہرین لسانیات (Linguists) محترمہ کارینا جہانی، فارل ٹیمو تھی اور برین اسپونر کے مقالوں کے تراجم شامل کئے گئے۔ ان میں بلوچی زبان کو معیاری (Standardisation) بنانے اور اسے مٹنے سے بچانے کی کوششوں کو کامیاب بنانے کے لئے گراں قدر آراء موجود ہیں۔ "مادری زبانوں میں تعلیم کی اہمیت" کے بارے محترمہ زبیدہ مصطفیٰ کے دو تحقیقی

و تخلیقی مضامین کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ایک مضمون محترم مشتاق صوفی کا ہے۔ جس میں زبانوں اور خاص کر اردو، ہندی اور بنگالی زبانوں کی اقتدار کی کشمکش میں کردار کے پس منظر پر بات کی گئی۔

حصہ اول میں میرے لکھے گئے مضامین کئی سالوں پر محیط ہیں۔ ان میں یونیسکو کے اعلانات اور کئی اعداد وشمار اور آراء ایک سے زیادہ بار لکھے گئے جو ہو سکتا ہے کارئین کی بوریت کا سبب بنیں۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

ڈاکٹر دین محمد بُزدار

25/مارچ2024

کوئٹہ

حصہ اول

With out prejudices to the status of national language a provicial Assembly may by law priscribe measures for the teaching promotion and use of a provincial language in addition to national language.
(Pakistan- Constitution)

”قومی زبان کے مرتبہ سے بد گمانی پیدا کئے بغیر ایک صوبائی اسمبلی کو قانونی اختیار ہے کہ وہ قومی زبان کے علاوہ صوبائی زبان کو پڑھانے اور اسکی ترقی کے لئے اقدامات تجویز کرے“۔(آئین پاکستان)

بلوچ، بلوچستان اور بلوچی

بلوچ ایک وسیع سرزمین پر آباد ہیں، جس کے شمال میں ہلمند (افغانستان) جنوب میں بحر عرب، مغرب میں دریائے سندھ اور مشرق میں سیستان (ایران) ہے۔ اس خطہ کو نصیر خان نوری والئی قلات نے بلوچستان کا نام دیا۔ بلوچ کون ہیں؟ کہاں سے آئے؟ اور کب آئے؟ جیسے سوالوں کے جوابات کی خاطر ہم ایک قدیم تاریخی کتاب گُرد گال نامگ سے مدد لیں گے یہ کتاب اخوند محمد صالح محمد زنگنہ کرد بلوچ نے فارسی میں تقریباً چار سو سال قبل لکھی تھی، اس کتاب کے مطابق بلوچ نسلاً کرد ہیں اور بوجہ اپنی فوجی نشان جو مرغی کا قلغی تھا جسے قدیم فارسی اور کردی زبانوں میں بلوچ کہتے ہیں، بعد میں یہ لوگ اسی نام سے موسوم ہو گئے اور انکی زبان کردی کی بجائے بلوچی کہلائی، بلوچی وہ زبان ہے جس میں آتش پرستوں کی کتاب آوستا لکھی گئی، اس طرح بلوچی ایک مقدس کتاب کی مقدس زبان ہے، اُس وقت بلوچ آتش پرست تھے، اس کے علاوہ ہخامنشی دور کے لکھے کتبے بھی کسی اور زبان سے زیادہ بلوچی سے مشابہت رکھتے ہیں۔ پروفیسر عبداللہ جان جمالدینی نے اس کتاب کا فارسی سے اردو ترجمہ کیا اور بلوچی اکیڈمی نے اسے فارسی اور اردو میں شائع کیا۔ مصنف کے مطابق اس نے یہ تاریخی مواد اپنے اجداد کے اسلامی مدرسے (جسے امیر تیمور گورگان نے ۱۳۸۳ء مطابق ۷۸۵ھ سیستان کے پایہ تخت زرنج پر قبضہ کے دوران لوٹ کر منہدم کیا تھا) کی بچی ہوئی تحریروں سے حاصل کیا تھا جو اس کے اجداد زرنج سے زابل لائے تھے، اس طرح یہ مواد چھ سو سال سے زیادہ قدیم ہے۔

کتاب میں بلوچ تاریخ اسطرح بیان کی گئی، جب پیشدادی خاندان کا آخری بادشاہ گرشاسپ فوت ہوا تو مادستان (کردستان) و فارس میں طوائف الملوکی نے جنم لیا۔ مادستان اور فارس کے امرء اور سردار اکٹھے ہوئے اور متفقہ طور پر ماد کرد قبیلے کے سردار قیقباد کو ۸۵۰ق م مادستان و فارس کے تخت پر بٹھایا، اس وقت مادستان کا دارالخلافہ اکباتان تھا۔ اس پر توران کے بادشاہ افراسیاب نے مخالفت کا جھنڈا بلند کیا کیونکہ وہ وراثت کی رو سے اپنے آپ کو پیشدادی خاندان کا حقدار سمجھتا تھا۔ اس جنگ میں افراسیاب کو شکست ہوئی قیقباد نے توران کے علاقوں کو ان کرد قبائل میں تقسیم کیا جو جنگ میں شریک تھے تاکہ اسکی سلطنت کی مشرقی سرحدیں محفوظ رہیں۔ اس طرح زنگنہ کرد بلوچ زابلستان میں، براخوئی کرد بلوچ توران اور اردگانی، کرمانی، مالی مکران میں آباد ہوئے یہ پانچوں قبائل کردوں کے ماد قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طرح بلوچ انہی کرد قبائل کے اولاد ہیں جو تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح اس خطہ میں وارد ہوئے۔ توران میں بائیس ترک قبائل پہلے سے موجود تھے، جو تُورک زبان بولتے تھے۔ انہوں نے فاتح براہوئی کردوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، براہوئی اور تُرک قبائل کے خلط ملط ہونے سے بلوچی زبان سے متاثر ہوئے تُورک زبان موجودہ براہوئی زبان کی شکل میں وجود میں آئی۔

ماد کردوں نے سلطنت مادستان و فارس پر چھ پشتوں تک تقریباً تین سو سال حکومت کی، ان فرمانرواؤں کے نام یہ ہیں، قیقباد، کیکاؤس، توس (جو کیخسرو کے نام سے بھی معروف ہوا) فریبرز، کوکسار اور آزدیاک۔ کردوں کے آخری بادشاہ، آزدیاک نالائق تھا۔ لوگ اس سے تنگ آ گئے تھے اسکی اپنی نرینہ اولاد نہ تھی۔ مادستان و فارس کے امراء وسرداروں نے باہمی مشورہ سے کورش ہخامنشی کو (جو

فارس کاامیر تھا) تخت پر بٹھایا۔ کورش نے کردوں سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھے،ہخامنشی حکمرانوں کے وقت تمام کرد امراء اپنے اپنے ولائتوں پر برقرار رہے۔ہخامنشی حکمرانوں نے نو پشتوں تک حکومت کی۔ دارا سوئم ہخامنشی خاندان کے آخری بادشاہ کو سکندر اعظم نے شکست دی اور پھر اسکے اپنے لوگوں نے اسے پکڑ کر ہلاک کر دیا تاکہ وہ سکندر اعظم کے تعاقب سے نجات پاسکیں۔

ادبا، شعرا، فنکار اور بلوچی

مغربی بلوچی لہجے میں تقریباً ہر میدان میں کام ہو رہا ہے۔ ادبا اور شعرا دل لگا کر بلوچی زبان کی خدمت کر رہے ہیں۔ کوئٹہ، تربت اور کراچی سے کئی ماہتاک (ماہنامے) نکلتے ہیں[1]۔ اس کے علاوہ ایک روزنامہ بھی نکلتا ہے۔ ان رسائل میں سیاسی مضامین، ڈرامے، افسانے وشاعری کے ساتھ ساتھ ہر موضوع پر لکھا جاتا ہے۔ روزنامہ آساپ[2] کا ایک صفحہ ہفتے میں دو دن بلوچی کے لئے مختص ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال کئی کتب شائع ہوتے ہیں۔ نامور شاعروں کے کلام کتابی صورت میں موجود ہیں۔ گلوکاروں کے ویڈیو آڈیو ہر جگہ دستیاب ہیں۔ بلوچی فلم اور ڈرامے گھروں میں شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ بولان، وَش ٹی وی اور سبز بات بلوچستان ٹی وی کی نشریات اسی لہجہ میں ہیں[3]۔ عام لوگ اپنی زبان سے محبت کرتے ہیں اور اسکی ترقی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ املا کا اختلاف گو موجود ہے۔ ہر ادیب اپنے پسند کے مطابق لکھنے پر بضد ہے۔ جبکہ بلوچی کو ذریعہ تعلیم تسلیم کرانے کے لئے کوششیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لوگوں میں یہ آگاہی نہیں کہ بلوچی زبان اور بلوچ قوم کی بقا اور ترقی بلوچی کو تعلیمی زبان قرار دینے میں ہی مضمر ہے۔ اس کے مقابلے میں سلیمانی بلوچی لہجہ جو سبی نصیر آباد، ڈیرہ بگٹی، کوہلو، ڈیرہ غازیخان، جیکب آباد اور اندرون سندھ میں آباد چالیس لاکھ سے زیادہ بلوچوں کی مادری زبان

---

[1]۔ اِن میں زیادہ تر بند ہو چکے ہیں۔ (ایڈیٹر)

[2]۔ روزنامہ آساپ سال 2009 کو بند کر دیا گیا۔ (ایڈیٹر)

[3]۔ بولان ٹی وی کے علاوہ دیگر چینلز کے نشریات بند ہیں۔ (ایڈیٹر)

ہے، میں بد قسمتی سے ایک بھی جریدہ شائع نہیں ہوتا۔ سلیمانی بلوچی میں سب سے پہلی تصنیف بابو شیر محمد مری کی "بلوچی کہنیں شاعری" اور "بلوچی زبان ءُ ادب ءِ تاریخ" ہیں جن میں مری صاحب نے حسب ضرورت سندھی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ محمود خان المعروف مومن بزدار نے مشہور شاعر چگھا بزدار کے کلام کو یکجا کر کے "چگھاء گفتار" کے نام سے شائع کرایا۔ غلام قادر لدوانی بزدار نے شاعری اور ادب پر کافی کام کیا اور بلوچی اردو میں کئی کتابیں شائع کیں۔ ہو سکتا ہے سلیمانی لہجہ میں کسی اور نے کوئی کتاب لکھی ہو جسکا مجھے علم نہ ہو۔ سلیمانی لہجہ کے شعرا میں تخلص کا رواج نہیں۔ شعرا کی اکثریت دیہاتیوں کی ہوتی ہے اس لئے انکی شاعری میں دوسرے زبانوں کے الفاظ کا استعمال بہت ہی کم ہوتا ہے۔ انکی شاعری میں مٹھاس اور فطری رنگ اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ پریس تک انکی رسائی نہیں۔ انکی شاعری عام طور پر "نڑ، سر" کے ساتھ گائی جاتی ہے اور کئی سال تک زندہ رہنے کے بعد ایسے شعرا اکثر گمنام ہو جاتے ہیں۔ ان پڑھ شاعروں کی شاعری قدرتی اور فی البدیح ہوتی ہے اور ہر شعر طویل ہوتا ہے ان شاعروں کو اپنے اشعار زبانی یاد ہوتے ہیں۔ سُری ان اشعار کو یاد کر کے نڑ کے ساتھ محفل میں گاتے ہیں۔ مشرقی بلوچستان میں نڑ سر عوامی موسیقی ہے۔ اسے بچے بوڑھے، عورتیں مرد شوق سے سنتے ہیں۔

بابو شیر محمد مری کہتے کہ "نڑ سر نے بغاوت کی۔ امیر کے اوتاک کو خیر باد کر کے غریب کے روح کی غذا بن گئی"۔ نڑ کے ساتھ ہر موضوع کی شاعری گائی جاتی ہے۔ نڑ کے تقریباً تیس، چالیس دھنیں (لئے) ہیں۔ ہر دھن کو دستانہ کہتے ہیں۔ کوئی بھی شعر ایک نہ ایک دھن پر صحیح بیٹھتی ہے۔ بزدار علاقہ میں ایک دستانہ اللہ تعالی کی تعریف کے لئے مخصوص ہے جسے "اللہ توئیں" کہتے ہیں جسکے

معنی ہیں اللہ تو ہی ہے۔ یہ دھن محفل کے شروع میں اور پھر آخر میں بجایا جاتا ہے۔ دو، تین دھنیں علاقائی پیروں کے نام پر ہیں۔ باقی دھنیں عشقیہ اور رزمیہ یا کسی بھی موضوع کے بارے ہوتی ہیں۔ ناڑی (نڑ بجانے والا) اور سری (نڑ کے ساتھ گانے والا) کو معاشرے میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر نوجوان ناڑی، سری بننے کی آرزو دل لئے پھرتا ہے۔ بابو شیر محمد کہتے تھے کہ "مینگلا نگبٹی جیسا ناڑی ابھی تک پیدا نہیں ہوا"۔ گھر میں نڑ بجانا قطعاً معیوب نہیں، تیس چالیس سال پہلے ہر کھڈر بولک (۱۵۔۲۰ گھرانوں پر مشتمل خاندان) میں ایک ناڑی اور سری اکثر ہوتا تھا۔ آجکل ایک تو ٹیپ ریکارڈ (سوشل میڈیا کا رسائی) عام ہونے اور دوسرا بیرونی اثرات کی وجہ سے ناڑی سری کم ہو گئے ہیں ،اب بھی مشرقی بلوچستان میں نڑ سر واحد عوامی موسیقی ہے جو مقبول عام ہے۔ چھوٹے سائز کے نڑ کو لنڈی یا ڈھو کہتے ہیں۔ اگر سائز بہت چھوٹی ہو تو اسے "زمبلی" کہتے ہیں۔ سنا ہے مولانا روم کے قبر پر ایک نڑ رکھا ہے جسے وہ بجاتے تھے۔ مشرقی بلوچستان کے دوسرے مقبول ساز سریندا اور جوڑی (الغوزہ) ہیں۔ جن کے ساتھ بھی سری سر دیتا ہے اور انکی دھنیں نڑ والی ہی ہوتی ہیں۔ نڑ کی چند دھنوں کے نام یہ ہیں۔ لفنگ۔ شیشک۔ پھرک۔ دادلی۔ چنی دامن (شوذع)۔ آفانی پھری۔ درائی۔ اللہ توئیں (اللہ تھوائے) وغیرہ۔

بلوچی زبان، رسم الخط اور املا

بلوچی زبان کے دو بڑے لہجے ہیں۔ کئی کا خیال ہے کہ تین ہیں۔ پھر ہر لہجہ معمولی فرق کے ساتھ کئی صوتی جہات پر مشتمل ہے۔ اسکی بنیادی وجہ بلوچی زبان کا معیاری نہ ہونا یعنی بلوچی کا ذریعۂ تعلیم نہ ہونا ہے۔ دوسری وجوہات میں وسیع رقبہ، بکھری آبادی، پسماندگی، انفراسٹرکچر کا نہ ہونا، حکومتی سرپرستی سے محرومی اور مارکیٹ پر دوسری زبانوں کا غلبہ ہے۔ دو بڑے لہجے سلیمانی اور مکرانی یا مشرقی اور مغربی ہیں۔ تیسرا رخشانی ہے گو کہ وہ مکرانی لہجے کے قریب ہے۔ کئی کا خیال ہے رخشانی مکرانی اور سلیمانی لہجوں کو ملانے والا لہجہ ہے۔ عام بلوچ دوسرے لہجہ کو مشکل سے سمجھ پاتا ہے، شاعری کو سمجھنا اور لطف اندوز ہونا تو دور کی بات ہے[1]۔ ڈر ہے لہجوں کی یہ دوری بڑھتے بڑھتے دو زبانوں کی شکل اختیار نہ کر جائے۔ اس پر بلوچ ادبا، دانشوران اور باشعور طبقے کو لازمی توجہ دینی چاہیے جو اس مسئلے کو نہ چھیڑنے فراموش کرنے اور یہاں تک کہ دبانے کی پالیسی پر گامزن لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم / کمیونٹی کی ترقی اور خوشحالی اسکی زبان کی ترقی سے مشروط ہے۔ بد قسمتی سے قوم پرست پارٹیوں کی تمام انرجی پارلیمنٹ اور اقتدار تک رسائی پر صرف ہو رہی ہے اور اسی طرح اُنکی اسٹوڈنٹس ونگز بھی زبان کے اہمیت سے بے خبر ہیں۔

---

[1] ۔ سوشل میڈیا اور آمد ورفت کے ذرائع میں بہتری کے بعد یہ فلا کم ہوتا جارہا ہے۔ (ایڈیٹر)

اس پر اختلاف نہیں کہ بلوچی عربی رسم الخط میں تحریر کی جائے، صرف املا(Spelling)پر اتفاق نہیں ہو پارہا۔ دراصل معیاری رسم الخط اور املا ایک اتھارٹی(Athority) ہی رائج کرتی ہے اور پھر اسکی سرپرستی کرتی ہے۔ اگر صوبائی حکومت توجہ نہ دے، تو میرے خیال میں پھر یہ اتھارٹی بلوچی اکیڈمی ہی ہوسکتی ہے۔ اسے ہر سال بلوچی میں درجنوں کتب شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہے اور بلوچی اکیڈمی کا فرض ہے کہ وہ برسراقتدار حکومتی حلقوں کو قائل کرے کہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم ہی بچوں کے لئے بہترین تعلیم ہے اور یہ حقیقت یونیسکو کا منظور شدہ ہے۔ جب ایک ہی رسم الخط اور املا میں ۵/۶ لاکھ افراد مدرسوں سے پڑھ کر فارغ ہونگے تو بلوچی ادیب/ادیبہ بھی وہی رسم الخط، املا اپنانے پر مجبور ہونگے۔

اس طرح معیاری زبان کی جو خاص قسم تعلیم میں رائج ہوتی ہے وہ زبان کی سمت کو اس طرف متعین کرتی ہے، جس طرف اسے جانا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں دونوں لہجوں کو قریب تر لانے کا اس سے بہتر اور انتخاب نہیں ہو سکتا کہ دونوں کو ایک ہی طرح لکھا جائے اور ادائیگی (تلفظ) ہر کوئی اپنے لہجے میں کرے۔

نواب محمد اکبر خان بگٹی جب وزیر اعلیٰ بنے انہوں نے مادری زبانوں بلوچی ،براہوئی، پشتو میں پرائمری تعلیم کی ابتدا کی منظوری دی۔ بلوچی میں پہلی، دوسری اور تیسری جماعت کے لئے جو کتب لکھی گئیں ان میں دونوں لہجوں کو ایک طرح لکھا گیا۔ اس کے لئے پانچ نئے حروف اپنائے گئے جو یہ ہیں۔

(۱) ث:ت اور ث کے لئے جیسے ،مات۔یا۔ماث۔یا۔ماس۔

(۲) فپ:پ اور ف کے لئے جیسے لاپ یالاف۔

(۳) ذ: د اور ذ کے لئے جیسے واد یاواذ۔

(۴) ک:خ اور ک کے لئے جیسے گنوک یا گنوخ۔

(۵) ک:گ اور غ کے لئے جیسے روگ یاروغ۔

اس سے بہتر کوئی متبادل ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ویسے تو مجھ سمیت ہر بلوچ یہی کہے گا اور چاہے گا کہ اسکے علاقے یا لہجے کی بلوچی سب سے اچھی ہے۔ہر کوئی اسے اپنائے اور اسے ہی تعلیمی اداروں میں پڑھایا جائے۔لیکن بلوچ بلوچی زبان کی دیرپا مفاد میں جو بہتر اور ممکن ہو، وہی ہونا چاہیئے۔

زبان اور اسکی طاقت

بچپن میں یہ ضرب المثل سنا تھا "پڑھو فارسی بیچو تیل۔ آگے آگے دیکھو قدرت کے کھیل"، یعنی فارسی پڑھنے کے باوجود تیل بیچنے جیسا ادنا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ محاورہ مغلیہ دور کا ہی ہو سکتا ہے، جب ہندوستان میں فارسی کی طوطی بولتی تھی۔ اس سے زبان کی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، زبان کی طاقت کسی زبان کی وہ خصوصیت ہے جو وہ اپنے بولنے اور استعمال کرنے والوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تسکین کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ جیسے اچھا کاروبار، اچھی نوکری، بنگلہ گاڑی، عزت، شہرت وغیرہ۔ بلوچی پشتو پنجابی سندھی اور اردو سب پاکستانی زبانیں ہیں لیکن اردو کو سب سے زیادہ طاقتور زبان بنادیا گیا ہے۔ انگریزی گو کہ پاکستان میں کسی کی زبان نہیں لیکن انگریزی اردو سے بھی طاقتور ہے۔ کسی فرد کو طاقت روزگار سے ملتی ہے اور کوئی بھی طاقت کے دائرے میں اس وقت داخل نہیں ہو سکتا جب تک اسے کسی اجارہ دار زبان یا زبانوں پر عبور حاصل نہ ہو۔ انگریزی زبان پہلے برطانیہ اور اب امریکہ کی معاشی اور فوجی برتری کی وجہ سے بین الاقوامی زبان بن گئی۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے دنیا کی بڑی زبانوں جیسے ہندی، روسی فرانسیسی وغیرہ کو انگریزی سے خطرات لاحق ہو گئے۔ ہمارے ملک میں بھی بلوچی، پشتو، پنجابی اور سندھی کو انگریزی اور اردو سے ویسی ہی خطرات لاحق ہیں۔ کیونکہ ان زبانوں کو حکومتی سرپرستی حاصل ہے اور طاقت کے دائرے میں یہی زبانیں استعمال ہوتی ہیں اور اپنے استعمال کرنے والوں کو روزگار اور عزت دے سکتی

ہیں۔ بلوچی، براہوئی، پشتو، پنجابی کی وہ حیثیت نہیں کہ اپنے استعمال کرنے والوں کو عزت اور روزگار دلا سکیں۔ پشتو، پنجابی اور سرائیکی بڑے شہروں اور بڑی آبادی کی زبانیں ہیں اس لئے انکی سلامتی کو کوئی فوری خطرہ در پیش نہیں۔ بلوچی براہوئی نہ تو شہری اور منڈی کی زبانیں ہیں اور نہ انکے بولنے والوں کی کثیر آبادی ہے۔ بلوچ وسیع بلوچستان میں پھیلے ہوئے ہیں، اس لئے بلوچی، براہوئی زبانیں مٹنے کے خطرے سے دوچار ہیں۔

کئی ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ زبان مرتی ہے کیونکہ وہ خودکشی کرتی ہے۔ خودکشی سے انکی مراد یہ ہے کہ زبان بولنے والے اسے بولنا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن اگر کوئی اس بات کا تجزیہ کرے کہ لوگ اپنی زبان بولنا کیوں چھوڑ دیتے ہیں تو وہ آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ زبان سرکاری سرپرستی سے محروم ہونے کی وجہ سے طاقت اور اختیار کی سطح پر استعمال نہیں کی جاتی۔ اس کے بولنے والے وہی زبان سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو انہیں عزت اور روز گار دے سکے۔ جب لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتاہے کہ انکی زبان اشرافیہ کی زبان نہیں اور انکی زبان انہیں عزت اور روزگار نہیں دے سکتی، تو وہ اپنی زبان پر شرمندہ ہوتے ہیں اور اسے بولنا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں انکی پسماندگی، غربت، دربدری میں انکی زبان اور شناخت کا بھی ہاتھ ہے۔ ان وجوہات کی بناپر ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں جو زبان کو قتل کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ حالات کسی اور طاقتور زبان کے لئے سازگار ماحول پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے ایسے طاقتور زبان کو قاتل زبان کہا جا سکتا ہے۔ اپنی زبان سے بیگانگی اور اسکی عزت نہ کرنے کی مثال ڈیرہ غازیخان، نصیر آباد اور جیکب آباد کے بلوچوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جہاں ان پر اُردو سرائیکی اور سندھی زبانوں کا غلبہ ہے اور بلوچی صرف چاردیواری

تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ان علاقوں میں بلوچی کو خود کشی کرتے دیکھا جاسکتا ہے۔یہی حال ایران اور افغانستان میں بھی بلوچی کا ہے۔جہاں فارسی اور پشتو کا مکمل غلبہ ہے۔کراچی کے بلوچوں کو شاباش ہے جو نامسائد حالات کے باوجود نہ صرف اپنی زبان بچائے ہوئے ہیں بلکہ اسکی ترقی کے لئے دن رات کام کررہے ہیں۔اگر حکومت سرکاری سطح پر بلوچی براہوئی اور سرائیکی زبانوں کو تعلیمی اداروں، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر بلوچستان میں جائز مقام دے تو یہ زبانیں اپنے بولنے اور استعمال کرنے والوں کو روزگار اور عزت دونوں طرح کے مواقع فراہم کریں گی۔

بلوچ علماء کرام اور بلوچی زبان

بلوچی زبان کی خدمت میں بلوچ علما کرام کا کردار بنیادی رہا اور آج بھی ہے۔ علما مسجد اور مدرسوں میں دین کی تبلیغ اپنی مادری زبان میں کرتے ہیں اس طرح زبان کی خدمت میں انکا ایک کردار ہے۔ علماء میں سب سے زیادہ بلوچی زبان کی خدمت کا اعزاز مولانا خیر محمد ندوی کو جاتا ہے جنکی کوششوں سے ۱۹۵۳ میں ریڈیو پاکستان کراچی سے بلوچی نشریات کا آغاز ہوا۔ انہوں نے کراچی میں ایک سکول بھی کھولا جس میں بلوچی پڑھائی جاتی تھی۔ بھٹو کے دور میں اس سکول کو بھی قومیایا گیا، پھر اسکا انتظام انہیں واپس نہ مل سکا۔ مولانا صاحب کراچی سے ماہنامہ ''اومان'' کے نام سے ایک بلوچی ماہتاک بھی نکالتے رہے۔ اگر مولانا خیر محمد ندوی کو ''بابائے بلوچی'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ ڈھاڈر، ''درخان'' سے مولانا محمد فاضل درخانی نے ''مدرسہ درخانی'' کی بنیاد رکھی۔ مولانا حضور بخش جتوئی اور مولانا محمد عمر دینپوری ان کے ساتھ اسی مدرسہ میں کام کرتے رہے۔

ان علماء کرام نے پہلی بار قران مجید کا بلوچی اور براہوئی میں ترجمہ کیا اور بلوچی، براہوئی میں سو سے زیادہ کتابیں لکھیں اور بھی کئی علمانے زبان کی خدمت کی ہوگی۔ لیکن افسوس بلوچ علما میں اب زبان کی خدمت کا وہ پہلے والا جذبہ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ غیر ضروری طور پر ہر جگہ مادری زبان پر اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ذاتی تجربہ کی بنیاد پر دو واقعات کا یہاں ذکر کرونگا:

جب میری پوسٹنگ خضدار میں تھی ایک بار جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد گیا۔ مولوی صاحب اردو میں تقریر کر رہے تھے۔ انکی اردو اچھی نہ تھی اور مشکل سے بول پارہے تھے۔ نمازیوں کی اکثریت براہوئی بولنے والے ان پڑھ مزدوروں کی

تھی۔ میرے خیال میں نہ مولوی صاحب اپنا مدعا صحیح بیان کر پا رہے تھے اور نہ ہی سامعین مفہوم سمجھ رہے تھے۔ اگر مولوی صاحب براہوئی میں تقریر کرتے جو انکی اور سامعین دونوں کی زبان تھی تو وہ اپنا پیغام نمازیوں تک بہتر پہنچاتے اور نمازی بھی ان سے فیضیاب ہو سکتے تھے۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ اگر دس آدمیوں میں ایک غیر بیٹھا ہو تو ہم اسکی زبان یا اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔

دوسرا واقعہ کوئٹہ کا ہے: گولی مار چوک کے نزدیک سبزل روڈ پر ایک مسجد میں مولوی صاحب فارسی میں تقریر کر رہے تھے۔ نمازیوں کی اکثریت بلوچ تھی صرف چند افراد اور مولوی صاحب خود فارسی بان افغان مہاجر تھے۔ مجھے خضدار کے بلوچ مولوی یاد آ گئے اور سوچتا رہا ہم نے وطن دوستی اور اپنی زبان سے محبت کا جذبہ کہاں کھو دیا؟

قوم پرست اور بلوچی زبان

اگر بلوچ قوم پرست چاہتے تو1992ء سے زبان کی ہر طرح سے خدمت کر سکتے تھے۔ جیسے بلوچی کو صوبائی زبان کا درجہ دینا، مادری زبانوں میں تعلیم یا کم از کم اسے ایک مضمون کی حیثیت سے ابتدائی درجوں سے پڑھانے کا پروگرام۔ لیکن یہ بلوچ قوم پرست اپنے مفادات کے حصول کے علاوہ وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔ اکثر قوم پرست رہنما، دانشور اور پڑھے لکھے بلوچ قومی تشکیل میں زبان کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں اور انہیں معاشی مواقعوں کے حوالے سے بھی زبان کی اہمیت کا بخوبی علم ہے۔ لیکن پھر بھی وہ زبان کے مسئلے پر ذرا برابر پیش رفت کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ صرف اس لئے کہ کہیں زبان کے معاملے میں انکے حاکم ناراض نہ ہوں اور ان کے سیاسی مفادات کو زک نہ پہنچے۔ اِن رہنماؤں کی وجہ سے سیاسی ورکر اور طلبا تنظیمیں بھی زبان کے مسئلے کو اہمیت نہیں دیتیں۔ ان سے جب اس مسئلے پر بات کریں تو وہ معقول جواب نہیں دے پاتے۔ بلکہ جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل انہیں حکمرانوں کی ناراضگی کا خوف ہوتا ہے۔

پہلا موقع نیشنل عوامی پارٹی کو ۱۹۷۳ میں ملا تھا۔ تہتر کے آئین میں پہلی بار صوبوں کو اپنی زبان کو صوبائی زبان قرار دینے، مادری زبانوں میں تعلیم اور انکی ترقی کا حق ملا۔ سندھیوں نے اسکا فائدہ اٹھاتے ہوئے سندھی کو سندھ کا دفتری اور تعلیمی زبان قرار دیا۔ لیکن گورنر بلوچستان میر غوث بخش بزنجو نے اردو کو صوبے کا سرکاری زبان قرار دیا تھا۔ اس فیصلہ میں نیپ کی دوسری بلوچ لیڈرشپ بھی برابر کی شریک تھی۔ مجھے یاد ہے کہ لیاری کے ورکروں نے احتجاج کیا اور کئی ورکر نیپ اور بی ایس او سے مستعفی ہوگئے تھے۔

سردار عطااللہ مینگل نے حال ہی میں اپنے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا کہ یہ انکی بڑی غلطی تھی۔ جب ۱۹۸۹ میں نواب اکبر خان بگٹی وزیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے وطن دوستی اور قوم پرستی کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے تاریخ میں پہلی بار بلوچی، براہوئی اور پشتو کو صوبے میں پرائمری تک ذریعہ تعلیم قرار دیا۔ اساتذہ کو تربیت دی گئی، بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ نے بلوچی، براہوئی اور پشتو زبان میں کتابیں چھاپ لیں اور پڑھائی کا آغاز ہوا۔ اسی دوران نواب صاحب کی حکومت اور دوسری حکومتیں ختم ہو گئیں۔

نئے الیکشن ہوئے نواب صاحب کی پارٹی جے ڈبلیو پی اسمبلی میں سب سے بڑی پارٹی تھی لیکن مقتدرہ کی آشیر باد سے تاج جمالی وزیر اعلیٰ بن گئے، جبکہ انکے وزیر تعلیم ایک قوم پرست پارٹی کے لیڈر تھے لیکن اس قوم پرست کے وزارت کے دوران ہی مادری زبانوں میں تعلیم کا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اس دوران دیگر کئی بلوچ قوم پرست پارٹیاں تاج جمالی حکومت کا حصہ بنیں یا معاونت کی لیکن زبان کے مسئلے پر خاموش رہ کر شاید انہوں نے اپنی پاک دامنی کا ثبوت دیا ہو گا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ قوم پرستوں کے ساتھ ساتھ دانشوروں، ادبی تنظیموں، اکیڈمیز اور اسٹوڈنٹ تنظیموں نے ذرا برابر احتجاج نہیں کی۔ پھر ڈاکٹر مالک صاحب کئی سال وزیر تعلیم رہے، سردار اختر مینگل وزیر اعلیٰ بنے، بار بار کی یاددہانیوں کے باوجود کسی نے اس مسئلے پر توجہ نہ دی۔

قوم پرست صرف معاشی مطالبوں کی بات کرتے ہیں زبانوں کی ترقی کے بغیر حقیقی خود مختیاری ممکن نہیں۔ بلوچستان میں بلوچی براہوئی، پشتو، زبانوں کو اس وقت تک اپنا جائز مقام نہیں مل سکتا جب تک تمام سیاسی پارٹیاں، طلبا تنظیمیں، دانشور ادیب ملکران زبانوں کے لئے منظم جدوجہد نہیں کریں گے۔

بلوچی زبان اور میڈیا

بلوچستان تین ملکوں ایران افغانستان اور پاکستان میں منقسم ہے۔ پاکستان میں بلوچستان کے علاوہ پنجاب، سندھ اور سرحد میں بلوچ علاقے شامل ہیں۔ بلوچی پسماندہ ترین زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ میڈیا کے حوالہ سے پہلے الیکٹرانک میڈیا کا ذکر کریں گے۔ ریڈیو موئثر اور سب سے سستا ذریعہ ابلاغ ہے۔ جس کے لئے نہ تو بجلی اور نہ بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ تقریباً ہر فرد کا اس تک رسائی ممکن ہے۔ ریڈیو سے موسیقی، خبریں اور دیگر پروگرامز کا بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ لیکن بلوچی زبان کے پروگرامز جو کوئٹہ ریڈیو سے نشر ہوتے ہیں شاید کسی جگہ سنی جاتی ہونگی لیکن بروری میں (کوئٹہ میں) سنائی نہیں دیتی۔ متعلقہ افراد سے پوچھنے پر جواب ملا کہ مشینری کافی پرانی ہے شارٹ ویوز پر کوشش کر کے دیکھ لیں۔ اس کے علاوہ خضدار ریڈیو سٹیشن سے آدھا گھنٹہ صبح اور آدھا گھنٹہ شام بلوچی پروگرامز نشر ہوتے ہیں جو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تربت ریڈیو سٹیشن کی نشریات بھی محدود علاقے تک سنی جاتی ہے۔ پی ٹی وی بولان جس کی نشریات گو کہ صرف دو گھنٹے کی ہوتی ہیں پھر بھی غنیمت ہے۔ لیکن اِس میں بھی چند پروڈیوسر بلوچی دشمنی میں بلوچی اوقات کار میں اردو اور دیگر زبانوں کے لوگوں کو لا کر بٹھاتے ہیں۔

سبی ریڈیو سٹیشن میں ایک چوتھائی کلوواٹ کی پاکٹ ٹرانسمیٹر نصب ہے اسکی نشریات آٹھ، دس کلومیٹر تک سنی جاتی ہیں اور اسلام آباد سے بلوچی خبریں صبح، شام ریلے ہوتی ہیں۔ سبی ریڈیو سٹیشن کا خوبصورت عمارت شہر کے بیچوں بیچ وسیع رقبہ پر بنی ہوئی ہے۔ عملہ کی تعیناتی بھی ہو چکی ہے۔ لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا عوام نشریات کی باقائدہ آغاز کا گزشتہ بیس سال سے انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے سردار فاروق خان لغاری، سردار یار محمد رند اور محترمہ زبیدہ جلال (جب وہ اقتدار میں تھے) کو سبی ریڈیو سٹیشن سے نشریات کے آغاز کی خاطر خطوط لکھے۔ سردار لغاری اور محترمہ زبیدہ جلال نے متعلقہ ادارے کو لکھا اور مجھے کاپی دی لیکن سردار رند نے کسی کاروائی کو مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ یہ انکا حلقہ انتخاب بھی ہے۔ یہ علاقہ بلوچی ادب اور ثقافت کا مرکز ہے۔ (بلوچی زبان وادب کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ ریڈیو سٹیشن سبی سے نشریات کا جلد آغاز ہو۔ جہاں تک پرنٹ میڈیا کی بات ہے مشرقی یعنی سلیمانی لہجہ میں ابھی تک کسی بھی جریدے کا اجرا نہ ہو سکا۔

۱۹۹۸ کی مردم شماری کے مطابق سبی اور نصیر آباد ڈویژنز کی آبادی تقریباً بیس لاکھ تھی۔ جسکی غالب اکثریت بلوچی بولتی ہے۔ اسی مردم شماری کے مطابق جیکب آباد اور اندرون سندھ بائیس لاکھ بلوچ بلوچی بولتے ہیں۔ ملحقہ ڈیرہ غازیخان اور ڈیرہ اسمعیل خان کے دامان اور پہاڑی علاقوں کے قبائل بھی بلوچی بولتے ہیں۔ لیکن مشرقی بلوچستان، سندھ، پنجاب اور سرحد کے (بلوچوں کے لئے جو مشرقی یا سلیمانی لہجہ بولتے ہیں) لئے ملک کے کسی بھی ریڈیو سٹیشن سے بلوچی پروگرامز نشر نہیں ہوتے۔ کوئٹہ اور خضدار ریڈیو سٹیشن کی نشریات کافی دور ہونے کی وجہ سے ان علاقوں تک سنائی نہیں دیتیں۔

اکیسویں صدی میں اتنی بڑی آبادی کو ریڈیو نشریات سے محروم رکھنا نہ صرف ملکی قوانین کی بلکہ بنیادی انسانی حقوق کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔اس محرومی کے ازالہ کے لئے خیرپور اور ملتان ریڈیو سٹیشن سے بلوچی کو مناسب وقت دینا چاہیئے اور سبی ریڈیو سٹیشن میں ہائی پاور (۱۰۰ کلوواٹ) ٹرانسمیٹر نصب کر کے باقائدہ نشریات کا آغاز کرنا چاہیئے۔اس کے علاوہ زبان سے محبت کرنے والے کسی بلوچ کے لئے ایف ایم ریڈیو کی گنجائش ہر وقت موجود ہے۔کابل ریڈیو سے جو بلوچی پروگرام نشر ہوتے تھے۔طالبان نے انہیں بند کر دیا تھا، جو ابھی تک شروع نہ ہو سکے۔ریڈیو زاہدان سے بھی بلوچی میں پروگرامز نشر ہوتے ہیں۔

مادری زبانیں اور حکمرانوں کا رویہ

اس وقت دنیا میں تقریباً ۷۰۰۰ (سات ہزار) زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے گیارہ زبانیں ایسی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد سو ملین سے زیادہ ہے، جو آبادی کا ۵۱ فیصد ہیں جنکی تفصیل یوں ہے۔

چینی (Mandarin) ۱۲۲۳ ملین، انگریزی ۳۷۲ ملین، ہندی / اردو ۳۱۶ ملین، ہسپانوی ۳۰۴ ملین، عربی ۲۰۱ ملین، پرتگیزی، ۱۶۵ ملین، روسی ۱۵۵ ملین، بنگالی ۱۲۵ ملین، جاپانی ۱۲۳ ملین، جرمن ۱۰۲ ملین۔ دنیا کی ۹۰ فیصد زبانیں صرف ،۵ فیصد آبادی بولتی ہے اور دنیا کی ایک تہائی زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد ہزار (۱۰۰۰) سے کم ہے اور آدھی زبانیں بولنے والوں کی تعداد، دس ہزار (۱۰۰۰۰) سے کم ہے آئندہ پچاس سالوں میں ایسی زبانوں کے ختم ہونے کا شدید خطرہ ہے۔ اس وقت بھی ہر ماہ ۲ سے ۳ زبانیں مر رہی ہیں۔

اب پاکستانی زبانوں کی بات کریں گے، اردو ہماری اور ہندوستانی مہاجروں کی مادری زبان ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کی بڑی مادری زبانیں (Indiginous Languages) اورانکے بولنے والوں کی تعداد، ۲۰۰۱ کے مردم شماری کے لحاظ سے اس طرح ہے۔ پنجابی ۱۵.۴۴ فیصد، سندھی ۱۴.۰۷ فیصد، پشتو ۱۵.۴۲ فیصد، سرائیکی ۱۰.۵۳ فیصد، اردو۔ ۷.۸۰ فیصد، براہوئی / بلوچی، ۴.۵۷ فیصد، دیگر زبانیں ۶.۸۳ فیصد۔

انڈی جینس زبانیں وہ ہوتی ہیں جن کے بولنے والے قدرتی طور ایک خطہ زمین کے مالک ہوتی ہیں، محمد علی جناح نے، ۴ فروری ۱۹۴۸ کو ڈھاکہ میں اعلان کیا

تھا کہ اردو اور فقط اردو پاکستان کی قومی زبان ہو گی، شاید انکا خیال ہو کہ اردو مقامی زبان نہیں، اس لئے مقامی زبانیں بولنے والے اسے تسلیم کرلیں گے یا یو پی کے کسی مشیر نے انہیں غلط مشورہ دیا ہو۔ پنجابی، سندھی اور پشتو بولنے والوں نے کوئی خاص مخالفت ظاہر نہ کی، لیکن بنگالیوں نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا، اس فیصلے سے نہ صرف بنگالیوں کی اپنی زبان کے ساتھ محبت کے جذبات مجروح ہوئے بلکہ یہ انکے معاشی امکانات اور سیاسی مواقع کا بھی سوال تھا۔ بنگالی مڈل کلاس زبان کی اہمیت سے بخوبی واقف تھی، بابائے اردو مولوی عبدالحق بنگالیوں کو اردو کے حق میں راضی کرنے ڈھاکہ گئے اور تقریر کی کہ خداوند کی پسندیدہ زبانیں وہ ہیں جو دائیں سے بائیں لکھی جائیں، جیسے اردو، عربی، فارسی وغیرہ۔ اگلے دن بنگالیوں نے ڈھاکہ میں تمام اردو سائن بورڈ توڑ کر بنگالی زبان کے بورڈ لگا دیئے۔

جب جنوری ۱۹۵۲ میں دستور ساز کمیٹی نے اردو کو واحد سرکاری زبان بنانے کی سفارش کی تو ۲۱ فروری کو ڈھاکہ کے طلبا نے بنگلہ زبان کے حق میں جلوس نکالا، جلوس یاداشت پیش کرنے وزیر اعلی ہاؤس کی طرف بڑھا تو ڈھاکہ میڈیکل کالج کے پاس پولیس نے فائرنگ کی، ۵ طلبا شہید ہو گئے۔ پھر ۲۲ فروری کو شہیدوں کے جنازے کے جلوس پر بھی گولی چلائی گئی، چار مزید بنگالی بنگلہ زبان پر قربان ہو گئے، ۲۳ فروری کی رات ڈھاکہ میڈیکل کالج کے طلبا نے راتوں رات ''شہید مینار'' کے نام سے ایک یادگار قائم کی، جسے مارچ ۱۹۷۱ میں فوجی کاروائی کے دوران گرا دیا گیا، اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو نے اسی مناسبت سے ۲۱ فروری کو مادری زبانوں کا دن قرار دیا۔ اس طرح ۴ فیصد انڈین مہاجروں کی زبان کو، ۵۴ فیصد بنگالیوں کی زبان پر فوقیت دیکر بنگلہ دیش کی بنیاد رکھ دی گئی، پھر جب ۱۹۷۳ کا آئین بنا اور سندھ میں سندھی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا، تو اُردو بولنے والوں نے

سندھ بھر میں ہنگامے کئے، جنگ اخبار نے ماتمی ایڈیشن نکالے، جن کے کناروں پر لکھا تھا" اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے"۔ پھر حکومت نے سندھی، اردو دونوں کو سرکاری زبان قرار دیا۔ لیکن بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت نے اردو کو سرکاری زبان قرار دیکر اور مادری زبانوں کو ذریعہ تعلیم نہ بنا کر فاش غلطی کی جسکا ہم خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اس سے قبل لیاقت علی خان نے کراچی کے ۱۳۰۰ سندھی سکول بند کر دیئے اور سندھ یونیورسٹی کو کراچی سے حیدر آباد منتقل کیا گیا اور سندھی زبان کو کراچی سے مکمل بے دخل کر دیا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے پاکستان آکر علی الاعلان کہا بلکہ لکھا کہ "پاکستان میں اُردو واحد اسلامی زبان ہے، باقی سب زبانیں بت پرستوں اور کافروں کی ہیں"۔ دنیا میں ہر جگہ اکثریتی زبان اقلیتی زبانوں کے لئے خطرہ بن جاتی ہے، لیکن ہمارے ملک میں ایک چھوٹی اقلیت (جو مہاجر ہے) کی زبان اکثریتی زبانوں پر اس حد تک حاوی ہے کہ وہ اپنی بقا کی جدوجہد بھی نہیں کر پارہے ہیں۔

مقامی زبانوں کو ایک اور سنگین خطرہ ان کے بولنے والوں کا اقلیت میں چلے جانا ہے۔ بلوچستان، سندھ، اور فرنٹیئر (موجودہ خیبر پختونخواہ) میں اسلامی بھائی چارے کے نام پر لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانی، برمی، بنگالی اور افغان مہاجرین کو لاکر آباد کیا گیا ہے اس کا بنیادی مقصد چھوٹی قومیتوں کو یہاں تک کمزور کرنا ہے کہ وہ اپنے حقوق کی بات کرنے کے قابل نہ رہیں۔ بلوچی وہ زبان ہے، جس کے مٹنے کا خطرہ سب سے زیادہ ہے، بلوچ قوم تین ملکوں ایران افغانستان اور پاکستان میں تقسیم ہیں اور پاکستان میں بلوچستان کے علاوہ سرحد، پنجاب اور سندھ میں بلوچ علاقے شامل ہیں، اور بلوچی ہر جگہ سرکاری سرپرستی سے محروم ہے۔

چھوٹی قومیتوں کی زبان اور ثقافتوں کو نظر انداز کرنے کے دو وجوہات ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ حکمران انہیں ہر صورت اقتدار کے دائرے سے باہر رکھنا چاہتے ہیں، جس میں وہ گزشتہ ۶۰ سال سے کامیاب چلے آرہے ہیں، دوسرا یہ کہ بعض حکمران حلقوں کی شروع سے یہ سوچ ہے وہ قومی یکجہتی اور ملکی استحکام کو یکسانیت میں ڈھونڈ رہے ہیں، جیسے ایک قوم، ایک زبان، ایک ثقافت اور تاریخ وغیرہ، جو اکیسویں صدی میں قرون وسطیٰ کی پسماندہ ذہنیت کی عکاس ہے۔

بین الاقوامی ماہرین آج اس بات پر متفق ہیں کہ قوموں میں نفاق کی وجہ زیادہ زبانوں کا استعمال نہیں بلکہ مفادات کا ٹکراؤ ہے، دنیا میں زبانوں کو تاریخ اور ثقافت کے بے بہا خزانے کی طرح دیکھا جاتا ہے۔ بڑی زبان کی ترقی کی بجائے بہت سی زبانوں کی ترقی ثقافتوں کے درمیان برداشت کی ضمانت ہوتی ہے۔ سویت روس کے ٹوٹنے کے بعد مشرقی یورپ میں نسلی فسادات کی وجوہات معلوم کرنے کے لئے یورپی یونین نے اسکالرز کی ایک تحقیقی کمیشن بٹھائی، اسکی تجاویز کو "ہیگ تجاویز" کا نام دیا گیا، انہوں نے نسلی فسادات کی بنیادی وجہ قومی جبر کو قرار دیا اور تجویز دی کہ چھوٹی قوموں کو اپنی شناخت کے تحفظ کا پورا حق ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب انکی مادری زبان میں تعلیم کا بندوبست ہو۔

مادری زبان میں تعلیم: عالمی تناظر!

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے ۱۹۵۱ میں مادری زبان میں تعلیم کو بچوں کا حق قرار دیا۔ اس قرارداد پر تمام ممبر ممالک نے دستخط کیئے جن میں پاکستان بھی شامل تھا۔ اس وقت دنیا کے اکثر ممالک میں اس پر عمل ہو رہا ہے ہندوستان میں اسّی (۸۰) سے زیادہ مادری زبانوں میں تعلیم دی جارہی ہے اور وہاں ہر ریاست کی زبان قومی اور سرکاری زبان ہے۔ اب وہ دور دراز چھوٹے چھوٹے بچھڑے قبائل کے علاقوں کے بچوں کو بھی انکی مادری زبان میں تعلیم دینے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے تعلیمی پروگرام میں لسانی اور ثقافتی تنوع (Diversity) کو مجوعی قومی ثقافتی ذرخیزی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں اس وقت گیارہ قومی زبانیں ہیں جبکہ آزادی سے قبل صرف دو زبانوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔ آج ترقی یافتہ دنیا نے چھوٹی چھوٹی قومیتوں اور گروہوں کے لسانی حقوق کا مکمل تحفظ کیا ہوا ہے، ہر ملک میں بچے ابتدائی تعلیم مادری زبان میں حاصل کر رہے ہیں۔ پھر قومی اور بین القوامی زبان بتدریج مراحل میں سیکھتے ہیں، ان ممالک میں مہاجر بچوں کے لئے بھی مادری زبان میں تعلیم کا مکمل انتظام ہے، کینیڈا کی دو قومی زبانیں فرانسیسی اور انگریزی ہیں، وہاں ریڈ انڈین جو آبادی کا ایک فیصد ہیں، انکی آبادی پھیلی ہوئی اور ہر قبیلے کی زبان بھی جدا ہے اِن کے بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جارہی ہے۔ ناروے میں ستر (۷۰) زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں اردو بھی شامل ہے اور ان سب زبانوں میں ابتدائی تعلیم کا انتظام موجود ہے۔ ۱۹۹۱ میں امریکہ کے محکمہ تعلیم نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں کہا گیا کہ ابتدائی درجوں میں بچوں کی مادری زبان پر اسکول میں جتنی توجہ دی جائے، بچے بعد میں اتنا انگریزی زبان سیکھنے میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دو زبانیں سیکھنے سے بچے اور بھی کئی طرح کے صلاحیتوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

سماجی عزت ،وقار اور روزگار کے مواقع ریاستی اور بین الاقوامی زبان کے جاننے سے حاصل ہوتی ہیں مگر پھر بھی تعلیمی ماہرین مادری زبان پر زور دے رہے ہیں۔یونیسکو کہتی ہے اس کے تعلیمی ماہرین سالوں کی انتھک محنت اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ابتدائی درجوں میں مادری زبان تعلیم کے لئے سب سے بہتر زبان ہے۔اس کی کئی وجوہات بیان کی گئیں جس میں کسی قوم یا لسانی گروہ کی زبان ثقافت اور تشخص کے علاوہ بچوں کی تعلیمی استعداد پر اس کے بے پناہ مثبت اثرات کا مرتب ہونا ہے۔پانچ سال کی عمر میں بچے کا ذہن نشونما کے ابتدائی مراحل میں ہوتا ہے، جتنا ممکن ہو اس پر کم سے کم بوجھ پڑنا چاہیئے،دوسری زبان میں پڑھنا اس کے لئے ذہنی دباؤ اور کوفت کا باعث بنتا ہے،مادری زبان میں تعلیم سے بچے کو سکول میں اپنے گھر جیسا ماحول میسر ہوتا ہے اور اسے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا،اس کے علاوہ بچہ ایسی زبان سے ابتدا کر رہا ہوتا ہے جس کے علم کا ایک ذخیرہ پہلے سے ہی اس کے پاس ہے، اُس سے ابتدا کرنے میں اسے دقت پیش نہیں آتی بلکہ جن چیزوں کے بارے میں اسے پہلے علم ہو،انکے پڑھنے سے بوریت کی بجائے اسے خوشی محسوس ہوتی ہے۔اسی لئے مادری زبان کی تعلیم سے بچوں کے اسکول چھوڑنے کی شرح میں حیرت انگیز کمی دیکھنے میں آئی۔

یونیسکو کہتی ہے کہ مادری زبان کی تعلیم دنیا میں ایک سو تیس (۱۳۰) ملین سے زیادہ ان بچوں کی ہے جو ابھی تک اسکول سے باہر ہیں ان کی تعلیم تک رسائی ادارے کی بنیادی حکمت عملی ہے کہ جس پر عمل درآمد ہونا ابھی باقی ہے۔مادری زبان کی تعلیم کے بارے میں یونیسکو کا کہنا ہے:

To reject a Childs language in school where he goes to study amounts to reject the child himself. He at once senses this rejection and is less likely to participate confidently in classroom activities.

”جس سکول میں بچہ پڑھنے جاتا ہے اسکی مادری زبان کورد کرنا، خود بچے کورد کرنے کے مترادف ہے وہ یکدم اس رد کرنے کے عمل کو محسوس کر لیتا ہے اور آئندہ کبھی کلاس روم کی سرگرمیوں میں اعتماد سے حصہ نہیں لیتا“

جب ایک بچے کو یہ بتایا جاتا ہے کہ اسکی زبان کمتر ہے یعنی اس میں تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے آپ کو دوسری زبان میں تعلیم دی جارہی ہے، تو دراصل اسے یہ پیغام دی جاتی ہے کہ وہ خود کمتر ہے، یہ بتاکر بچے کو منفی تصور دیا جاتا ہے کہ جس ”ثقافتی سرمائے“ سے اس کا تعلق ہے وہ دراصل سرمایہ نہیں بلکہ شرمندگی کا بوجھ ہے جو وہ اٹھائے پھر تا ہے، یہ سلوک بچے کو اپنی قومی شناخت، قومی ورثہ، تاریخ اور ثقافت کے ہر پہلو سے منکر ہونے کے لئے تیار کر تا ہے اور بچے میں اسکی اپنی حقیقی شناخت کے اہم پہلوؤں سے شرمندگی کی احساس کو جنم دیتاہے۔ اسی لئے چھوٹی اور کمزور قومیں گروہ، طبقے، کمیونیٹیز اور صنف، اپنی شناخت کے اہم پہلوؤں سے شرمندہ ہوتی ہیں۔

کسی بھی تعلیمی پروگرام میں زبان کا انتخاب بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مادری زبان میں بہت پیچیدہ انسانی تہذیبی اور تمدنی پہلو موجود ہوتے ہیں۔ بچوں میں اس کے اثرات آگاہی اور نفسیاتی بالیدگی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ بڑوں میں اس کے اثرات معاشرے میں سیاست، معیشت اور معاشرتی زندگی میں حصہ لینے کی اہلیت بڑھاتی ہیں۔ یونیسکو اپنی ایک رپورٹ میں کہتی ہے۔

"Years of research have shown that children who begin their education in their mother tongue make a better start and continue to perform better than those for home school starts with a new language. This conclution is now widely implemented, although we still hear of

Governments that insist on imposing a foreign language of instruction on young children, either in a mistaken attempt at modernity or to express the pre-eminence of a socialy dominant group."

برسوں کی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ جو بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم کی ابتدا کرتے ہیں، شروع سے ہی انکی کارکردگی بہتر ہوتی ہے اور انکی یہ اچھی کارکردگی مسلسل قائم رہتی ہے بہ نسبت ان بچوں کے جو اپنی تعلیم ایک نئی زبان سے شروع کرتے ہیں اب اس نتیجہ پر ہر کہیں عمل ہو رہا ہے، اگرچہ ہم اب بھی ایسی حکومتوں کے بارے سنتے ہیں جو چھوٹے بچوں پر اجنبی زبان تھوپنے پر اسرار کرتے ہیں، وہ ایسا یا تو غلطی سے جدیدیت کی خاطر کر رہے ہوتے ہیں یا سماجی طور پر حاوی گروہ کی زبان کو فوقیت دینے کی خاطر"۔

یونیسکو کے مطابق:

Education has the power to transfer people and countries alike, because it is the wellspring of equality, ability, social opportunities, economic stability, and national progress.UNESCO.

تعلیم ہی وہ طاقت ہے جو لوگوں اور قوموں کو برابری کی سطح لا سکتا ہے، کیونکہ تعلیم برابری، انسانی استعداد، معاشرتی مواقعے، معاشی استحکام اور قومی ترقی کا سرچشمہ ہے۔

مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت

قدرتی خزانوں سے مالامال سرزمین کے مالک ہونے کے باوجود بلوچ تین مملکتوں میں پسماندہ اور مظلوم تریں ہیں۔ بلوچ سرزمین کو اتنا پسماندہ رکھا گیا کہ کہیں بھی اسکی اپنی مارکیٹ وجود میں نہ آسکی انکے علاقے میں جو شہر آباد ہوئے، بلوچ کی بجائے ان پر درآمد نے غلبہ حاصل کیا اور انہیں کی زبان مارکیٹ پر حاوی ہو گئی جیسے کراچی، خان گڑھ، ڈیرہ غازی خان، کوئٹہ زاہدان، اسکی بنیادی وجہ ان ممالک کے حکمرانوں کا بلوچوں کی حق حکمرانی اور حق ملکیت سے انکار ہے، قومی محکومی کے ساتھ بلوچی زبان کا شمار بھی ان پسماندہ زبانوں میں ہے جن کے مٹنے کا خوف ہے۔ زبان کے مٹنے کے ساتھ اس کے بولنے والے بھی اپنی حیثیت کھو دیتے ہیں اسکی مثال بھی سندھ، پنجاب اور سرحد کے بلوچ ہیں آج ان میں صرف بلوچیت کا احساس باقی ہے، بلوچی جو انکی قومی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ انکے ڈاڈا کی بھی زبان رہی ہے کو دوبارہ سیکھنے کی بجائے انکی کوشش ہوتی ہے کہ وہ بلوچ جو ابھی تک بلوچی بولتے ہیں، اپنی زبان ترک کرکے سندھی سرائیکی سیکھیں اور اسے اپنائیں۔ پاکستان میں بلوچی اپنے جائز مقام سے محروم چلا آرہا ہے اسکی ایک وجہ تو اس مخصوص گروہ کی سوچ ہے جسکا اقتدار پر شروع سے قبضہ ہے، وہ ایک ملک، ایک مذہب، ایک قوم، ایک زبان ایک ثقافت کے نظریہ کے قائل ہیں، اور دوسری وجہ ہماری اپنی کمزوریاں ہیں، حالانکہ ملکی آئین میں پاکستانی زبانوں کو مکمل تحفظ اور ترقی کی ضمانت دی گئی ہے آرٹیکل ۲۸ میں لکھا ہے:

Subject to article 251 any section of citizen having distinct language,script or culture shall have the right to preserve and promote the same and subject to law establish institution for that purpose

آرٹیکل (۲۵۱) کے مطابق شہریوں کا کوئی بھی گروہ جنکی زبان،رسم الخط، یا ثقافت مختلف ہو انکو حق حاصل ہے کہ اسکی تحفظ کریں اور اسے ترقی دیں اور اس مقصد کے لئے قانون کے مطابق ادارے قائم کریں۔

آئین آرٹیکل (۲۵۱) سب سیکشن (۳) میں لکھا ہے۔

With out prejudices to the status of national language a provincial Assembly may by law priscribe measures for the teaching promotion and use of a provincial language in addition to national language

"قومی زبان کے مرتبہ سے بد گمانی پیدا کئے بغیر ایک صوبائی اسمبلی کو قانونی اختیار ہے کہ وہ قومی زبان کے ساتھ صوبائی زبان کو پڑھانے اور اسکی ترقی کے لئے اقدامات تجویز کرے"۔

اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق مادری زبان میں تعلیم بچوں کا بنیادی حق ہے، تعلیمی ماہرین کے مطابق مادری زبان میں تعلیم سے نہ صرف بچوں میں خود اعتمادی بڑھتی ہے بلکہ انکی تحقیقی اور تخلیقی استعداد میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور یہ کہ جو بچے مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ عملی زندگی میں دوسروں کے

مقابلے میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جہاں بھی مادری زبان میں تعلیم شروع کی گئی ہے، وہاں سکول چھوڑنے کی شرح میں حیرت انگیز کمی دیکھنے میں آئی۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں، میں نے عربی زبان میں قرآن کا نزول کر کے عربوں پر احسان کیا تاکہ وہ اس کتاب کو اچھی طرح سمجھیں۔ کوئی زبان چاہے جتنا چھوٹا کیوں نہ ہو، پوری انسانیت کی میراث ہوتی ہے۔ اس کے مٹنے کا مطلب ہے دنیا کی رنگینی سے ایک رنگ کا مٹ جانا۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں لسانی، ثقافتی تنوع کو ملکی سالمیت اور قومی یکجہتی سے متصادم تصور کیا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اگر کہیں یک زبان مہاجر بچے ہوں تو قانون کے مطابق مادری زبان میں انکی ابتدائی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ کینیڈا اور امریکہ میں ریڈ انڈین کے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دی جارہی ہے۔ اس کے باوجود کہ انکی آبادی قلیل اور بکھری ہوئی ہے اور جنکی مادری زبان بھی ایک سے زیادہ ہیں۔

زبان قومی تشخص اور ترقی کی بنیاد ہے اور اسکی حکومتی سطح پر استعمال اسکے بولنے والوں کے لئے انگنت معاشی مواقع پیدا کرتی ہے ۔ آج بلوچی پڑھنے والے نہیں ملتے اس لئے بلوچی اخبار، جرائد بہت جلد بند ہو جاتے ہیں۔ جب بلوچی میں تعلیم ہوگی چار، پانچ لاکھ بلوچی پڑھنے والے ہونگے تو وہ بلوچی اخبار، جرائد خریدیں گے، انہوں نے جس رسم الخط اور املا میں پڑھا ہوگا، لکھنے والے بھی اسی طرح لکھنے پر مجبور ہونگے۔ پرائمری تک مادری زبان اور قومی دونوں زبانیں پڑھائی جائیں، اس کے بعد بین الاقوامی زبان انگریزی شامل ہو، سائنس کے مضامین انگریزی میں اور دوسرے مضامین مادری اور اردو میں ہوں۔ کئی زبانوں میں تعلیم کا یہی طریقہ کار دنیا میں رائج ہے، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ بچوں اور

اساتذہ کی مادری زبان ایک ہی ہے، نہ کلچر کا مسئلہ ہے نہ انہیں پڑھانے میں کوئی دقت ہوگی رضا کارانہ طور پر کوئی بھی حکومت مادری زبانوں کو تعلیمی زبان قرار دیتے دکھائی نہیں دیتی۔ اس کے لئے شعور اجاگر کرنے اور رائے عامہ ہموار کرنے، ایک عوامی مہم چلانے کی ضرورت ہے جب تک ادبی تنظیمیں، دانشور، سیاسی ورکر اور طلبا لاتعلقی کا سمجھ میں نہ آنے والا رویہ ترک کر کے حکومت پر دباؤ نہیں ڈالیں گے، کوئی بھی حکومت مادری زبان کی تعلیم پر راضی نہیں ہوگی۔

زبان اور قومی شناخت

ہر زبان کی اپنی ثقافت ہوتی ہے۔ثقافت کسی قوم یا لسانی گروہ کی رسم و رواج، تاریخ،اقدار اور نفسیات کا نام ہے۔زبان کسی قوم کی شناخت کی علامت ہوتی ہے۔اس شناخت کو بچانے کا واحد ذریعہ مادری زبان کی تعلیم ہی سے ممکن ہے۔ہر زبان کو چاہے چھوٹی ہو یا بڑی تاریخ اور ثقافت کے بے بہا خزانے کی طرح دیکھنا چاہیئے۔زبان ہی ہے جو ثقافتی اقدار کو ایک نسل سے دوسری نسل،ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا دریعہ ہے۔لسانی اور ثقافتی تنوع (Diversity)بنی نوع انسان کی مشترکہ میراث ہے اور یہ تنوع ہمارے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ فطرت کے لئے بائیو ڈائیورسٹی (Bio-Diversity)۔دنیا میں امن ہم آہنگی اور خوشحالی کی خاطر لسانی اور ثقافتی تنوع کی ہمیشہ عزت کرنی چاہیئے۔اسے نہ ماننا، اسکی بیخ کنی کرنا غیر فطری عمل ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں شروع سے بولی جانے والی زبانوں اور ثقافتوں کو قومی تشکیل کے منافی سمجھا گیا اور قومی بقا یکسانیت میں تلاش کی جانے لگی۔ تعلیمی اداروں اور میڈیا کے ذریعے ایک قوم یعنی مسلمان قوم،ایک زبان یعنی اردو،ایک ثقافت یعنی اسلامی ثقافت کے فلسفے کو فروغ دیا گیا۔دراصل قابض حکمران اپنی اقتدار کو دوام دینے کی خاطر یہ سب کرتے رہے۔انہوں نے حب الوطنی اور اسلام کو اپنے حق میں بے دریغ استعمال کیا۔اختلاف کرنے والے ملک دشمن اور ملحد ٹھہرے۔اس طرح اردو کے علاوہ ملک میں بولی جانے والی تمام زبانیں اور ثقافتیں پاکستانیت کی زد میں آگئیں۔جعلی نظریوں کی یلغار نے ہمارا رشتہ اپنی زبان،

ثقافت، اقدار روایات اور تاریخ سے توڑ دیا۔ حکمران جانتے ہیں کہ زبان ہی وہ آلہ ہے جو لوگوں کو متحد کر سکتی ہے۔ اور اتحاد سے وہ اپنی ثقافت۔ تاریخ اقدار اور رسم رواج کو قائم رکھ سکیں گے اور اپنے معاشی حقوق لینے کے قابل ہونگے۔ اس لئے انہوں نے زبانوں اور ثقافتوں کو فرسودہ اور گھساپٹا قرار دیکر ایسے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی جو لوگوں کو مہذب بنانے کی آڑ میں ایسے کھیپ تیار کرنے لگی جو ہیں تو مقامی لیکن زبان ثقافت اور نفسیات کے اعتبار سے اپنے آقاؤں سے قطعی مختلف نہیں ہیں۔ اسی لئے آج تشخص کے بحران نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ مذہبی جنونیت فرقہ واریت، افراتفری، اقرباپروری، بدعنوانی اور بدانتظامی اگ آنے والی وہ فصل ہے جسکی کاشت حکمران برسوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ زبانوں اور ثقافتوں کے بارے اقوام متحدہ کا ادارہ یونیسکو کہتی ہے۔

Languages and identity are linked as the term mother tongue implies, a healthy identity balances different expects of our personality. A community expresses part of its identity in its language of instruction, and a healthy society makes choices that promote harmonious communities and confidential individuals. (UNESCO)

جہاں تک مادری زبان کا تعلق ہے زبان اور شناخت آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ ایک تندرست شناخت ہی ہماری شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو متوازن رکھتی ہے۔ ہر کمیونٹی اپنی شناخت کے ایک حصے کا اظہار بولی جانے والی زبان میں کرتی ہے ایک صحت مند سوسائٹی "انتخاب" کے حق کا احترام کرتی ہے۔ جس سے ہم آہنگ کمیونٹیز اور پراعتماد افراد کی پرورش ہوتی ہے۔

بلوچی زبان کو معیاری بنانا

(Standardization of Balochi Language)

کسی زبان کو معیاری بنانے کے معنی وہ عمل ہے جس سے اس زبان کے مروجہ لہجوں کو مضبوط کیا جاتا ہے اور انہیں برقرار رکھا جاتا ہے۔

(Standardization of language is the process by which conventional forms of the language are established and maintained.)

معیار کا کام یا تو زبان کی قدرتی ترقی سے ہو جاتی ہے یا پھر اسکے بولنے والے دو، تین یا زیادہ لہجوں (Dialects) کو ملا کر معیاری زبان کے طور پر لاگو کرتے ہیں۔ لہجہ زبان کی علاقائی قسم ہوتی ہے۔ ایک زبان میں کئی لہجے ایک فطری مظہر (Natural Phenomenon) ہے اور مختلف لہجوں کا مشترکہ نام زبان ہے۔ انسانی خیالات اور تجربوں کو اگلی نسلوں تک پہچانے اور بچوں کو اسکول میں پڑھانے کے لئے لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جسے تحریر کی زبان کہتے ہیں۔ تحریر کی زبان معیاری زبان ہی ہوتی ہے اور تمام لہجوں سے ملتی جلتی ہے لیکن کسی ایک لہجے سے مکمل تعلق نہیں رکھتی۔ برین اسپونر (Brain Spooner) کے مطابق ''معیاری بلوچی تمام لہجوں سے ملکر بنتی ہے۔ ایک لہجہ کی ترقی بلوچی زبان کی ترقی نہیں کہلائی جاسکتی''۔ معیاری زبان جسے لکھنے کی زبان کہتے ہیں ہر قوم کی مجبوری ہوتی ہے۔ معیاری زبان علمی ادبی اور تعلیمی زبان ہوتی ہے۔ دراصل بلوچی لکھائی ہی قومی رشتوں کو ترتیب دیتی ہے اور قومی یکسانیت (Harmony) کی ضامن ہوتی ہے۔ معیاری بلوچی کیسے ترتیب دی جائے؟ یہ ایک چیلنج ہے۔ یہ کام بلوچ ادیبوں،

دانشوروں، زبان زانت شخصیات اور بلوچی اکیڈمیز کی سرپرستی میں حل ہو سکتا ہے۔ محترم ڈاکٹر تاج بریسیگ نے اس مسئلے کے حل کے لئے ان چار پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے:

پہلا: لہجوں کا ادبی خزانہ،

دوسرا: لہجوں کا جغرافیہ (Geographical location of Dialects) یعنی لہجوں کی آپس میں نزدیکی اور ملاپ۔

تیسرا: کسی لہجے میں بات کرنے والوں کی تعداد اور انکے علاقے کی وسعت۔

چوتھا: ریاست اور اسکی سیاست۔ کیونکہ ریاستی اداروں کی پاس تعلیمی اداروں کی سرپرستی اور کنٹرول ہے۔ ہر دو زبانوں یعنی لکھنے اور بات کرنے، کی ترقی مدارس کی تعلیم سے منسلک ہے۔

تھیم فارل کے مطابق، "معیاری زبان نہ تو لہجوں کو پیچھے دھکیلتی ہے اور نہ انکی جگہ لے لیتی ہے۔ بلکہ وہ ان لہجوں کو اسطرح مکمل کرتی ہے کہ جن میدانوں میں وہ خود پورا نہیں اترتے، انہیں پورا اتارتی ہے۔ معیاری زبان جب تعلیم میں استعمال ہوتی ہے وہ زبان کی سمت کو اس جانب راغب کرتی ہے جس جانب اسے جانا ہوتا ہے۔ لہجے جو علمی ادبی خزانہ لاتی ہیں ان کے لئے معیاری زبان میں کافی جگہ موجود ہوتی ہے۔ بلوچی ایک ایسی زبان ہے جسے قدرت نے مختلف لہجوں اور متبادل لفظوں کے خزانوں سے نوازا ہے۔ یہ بڑی شرم کی بات ہو گی اگر ان خزانوں کو ضائع کیا جائے۔ چاہے یہ زبان کی مضبوطی کے لئے کیوں نہ ہو، جو معیار سے آتی ہے۔"

بلوچی زبان کے دو بڑے اور بنیادی لہجے مکرانی اور سلیمانی یا مغربی اور مشرقی ہیں۔ دونوں کے درمیان براہوئی اور پشتو زبان کے علاقے پھیلے ہیں۔ مکرانی لہجے

کو مزید، رخشانی اور مکرانی یا شمالی اور جنوبی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے رخشانی اور مکرانی لہجے جغرافیائی لحاظ سے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ سلیمانی لہجہ کوئٹہ کے نزدیک کولپور سے لیکر دریائے سندھ اور شمال میں ڈیرہ اسمعیل خان سے لیکر جنوب میں کراچی تک بولی جاتی ہے۔ مشرق کی جانب سرائیکی اور سندھی زبانیں بلوچی کو بری طرح چاٹ (Erode) رہی ہیں۔ یہ دونوں مارکیٹ کی زبانیں ہیں۔ انگریزوں کے وقت کی مردم شماری میں سلیمانی بلوچی بولنے والوں کو مکرانی بلوچی بولنے والوں سے زیادہ بتایا گیا ہے۔ گو کہ مغربی بلوچستان (ایرانی) اس مردم شماری میں شامل نہیں تھی 1990-91 میں جب نواب محمد اکبر خان بگٹی وزیر اعلی بنے تو انہوں نے بلوچی، براہوئی اور پشتو کو پانچویں جماعت تک پڑھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مکرانی اور سلیمانی لہجوں کو ملا کر ایک معیاری زبان کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل پانچ نئے حروف (نشان) اپنائے گئے۔

(i) فپ: ف اور پ کے لئے۔ جیسے لاف اور لاپ۔

(ii) ت: ت اور ث کے لئے جیسے ماث اور مات۔ (ت کے دو نقطوں کے نیچے ایک اور نقطہ)

(iii) ذ: د اور ذ کے لئے جیسے واد اور واذ۔ (ذ کے نقطہ کے اوپر ایک اور نقطہ)

(vi) ک: خ اور ک کے لئے۔ جیسے گنوخ اور گنوک۔ (خ کا سرا ک کے لڑے کے ساتھ لگا کر)

(v) ک: غ اور گ کے لئے۔ جیسے ورغ اور ورگ۔ (غ کا سرا ک کے لڑے کے ساتھ لگا کر)

ان حروف کا فائدہ یہ ہے کہ تحریر کی زبان ایک ہو گی اور الفاظ کی ادائیگی ہر کوئی اپنے لہجے میں کرے گا اور دونوں لہجوں میں بات کرنے والوں کے لئے اسے

اپنانا آسان ہے ۔ میرے خیال میں یہ حروف معیاری لکھائی کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ چھوٹی بڑی تبدیلیوں کی گنجائش ہر وقت موجود رہتی ہے۔ اگر یہ نشان یا ایسی گنجائش کہ لکھنے کی زبان ایک ہو، نہ اپنائی گئی تو مستقبل میں دونوں لہجے دوالگ زبانیں بن سکتی ہیں۔ڈیرہ غازیخان کے اکثر لکھاریوں نے اپسالا یونیورسٹی کے املا کو اپناکر سلیمانی لہجے (Sulemani Dialect) میں لکھنا شروع کیا۔اپسالا یونیورسٹی نے ،ح خ ص ض ط ظ ع غ اور ق کو ترک کیا۔انکی جگہ ملتی جلتی آوازوں کے دوسرے حروف استعمال کئے۔ گو کہ ایران،افغانستان اور پاکستان میں سرکاری اسکولوں میں بلوچی پڑھانے کے لئے سیاسی ماحول اب تک موافق نہیں۔اگر معیار کا فیصلہ ہو جائے تو آپس کی خط وکتابت،سوشل میڈیا، پرنٹ میڈیا،پرائیویٹ سکولوں اور اکیڈمیز میں معیاری زبان کو استعمال کر کے زبان، کلچر شناخت، قومی یکجہتی، قومی بقااور شناخت کی کوششوں کو تقویت دی جاسکتی ہے۔

مادری زبانیں اور یکساں تعلیمی نظام

24اپریل 2021 کی ایک اخباری خبر کے مطابق جمعہ کے روز بلوچستان اسمبلی اجلاس میں نصراللہ زیرے نے وزیر تعلیم کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ سابقہ دور حکومت میں مادری زبانوں بلوچی، براہوئی، پشتو، سندھی اور فارسی اور دیگر زبانوں کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھانے کی بابت باقاعدہ طور پر اسمبلی میں قانون پاس ہوا تھااور اس بارے سکولوں میں پرائمری کی سطح تک پڑھانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا مگر اب شنید میں آیاہے کہ حکومت مادری زبانوں کی تعلیم کا سلسلہ ختم کر رہی ہے، لہذا اس بارے تفصیل فراہم کی جائیں۔اس پر صوبائی وزیر تعلیم سردار یار محمد رند نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ صوبائی حکومت نے مادری زبانوں کی تعلیم کا سلسلہ بند کرنے سے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا البتہ قومی اسمبلی میں یکساں نصاب لانے کی قرارداد منظور ہوئی ہے اگر وہاں سے قانون منظور ہو گیا تو صوبہ اسکے بر عکس قانون پاس نہیں کر سکتا۔ میری خواہش ہے کہ مادری زبانوں میں بنیادی تعلیم دی جائے تاکہ چھوٹی زبانیں زندہ رہیں۔انکی خواہش پر یہ توجہ دلاؤ نوٹس کے جواب کو آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا تاکہ اس دوران مرکز اور صوبے سے معلومات اکٹھی کر کے ایوان کو فراہم کی جاسکیں۔جب آئین بنا اس وقت بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی (NAP)اور جمیعت علماء اسلام(JUI)کی مخلوط حکومت تھی۔ سردار عطااللہ مینگل وزیر اعلیٰ تھے۔نیپ کی لیڈرشپ نے بلوچی کی بجائے اردو کو صوبائی زبان قرار دیا۔اس اقدام سے انکی مجبوری کا ابتک پتہ نہ چل سکا۔حالانکہ ایک ابتدا ہو سکتی تھی۔شاید وہ حزب اختلاف کی ہمدردیاں

حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ اس اقدام پر جماعت اسلامی اور اسکی میڈیا نے نیپ حکومت کی بہت تعریف کی۔نواب محمد اکبر خان بگٹی جب 1988ء میں وزیر اعلیٰ بنے تو انہوں نے مادری زبانوں میں تعلیم کی ایک مخلصانہ کوشش کی ابتدا کی۔ بلوچی براہوئی اور پشتو میں ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا۔ بلوچی زبان کے املا کا فیصلہ بھی کیا۔ کتابیں چھپ گئیں اور ٹیچرز کی ٹریننگ مکمل ہوئی۔ تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اسی دوران اسمبلیاں تحلیل ہوئیں، پھر نئے الیکشن ہوئے۔نواب صاحب کی پارٹی JWP صوبے میں سب سے بڑی پارٹی بنکر ابھری، لیکن مرکز نے مداخلت کر کے تاج محمد جمالی کو وزیر اعلیٰ بنادیا۔مادری زبانوں میں تعلیم کا پروگرام دھرے کا دھرا رہا۔اس کھیل میں بلوچ پشتون قوم پرستوں نے بھی تاج جمالی کا بالواسطہ یابلاواسطہ ساتھ دیا۔اس کے علاوہ بلوچ پشتون ادیبوں،دانشوروں ،سیاسی پارٹیوں، طلبا تنظیموں،ادبی اکیڈمیوں میں سے کسی نے بھی اس پروگرام کو ترک کرنے پر ذرہ برابر احتجاج نہ کیا اور چپ سادلی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پیپلز پارٹی کی حکومت اقتدار میں آئی اور آصف علی زرداری صدر بنے۔دونوں ایوانوں نے متفقہ طور پر اٹھارویں ترمیم کی منظوری دی۔ جس کے تحت تعلیم کے شعبہ میں نصاب(Curriculum) سلیبس(Syllabus) پلاننگ (Planning)حکمت عملی(Policy) سنٹرز آف ایکسی لنس(Centers of excellence)اور تعلیمی معیار Standards کی ذمہ داریاں صوبوں کو دی گئیں۔اب آئین میں تبدیلی کئے بغیر تعلیم کے شعبہ میں مرکز مداخلت نہیں کر سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی صوبہ اپنے اختیارات سے ازخود دست بردار ہو جائے اور اپنے اختیارات مرکز کو تفویض کرے۔ ہمارے محترم وزیر تعلیم مطمئن رہیں اب مرکز کوئی قانون پاس نہیں کر سکتی۔اس

ضمن میں گزشتہ صوبائی حکومت نے بلوچی، براہوئی اور پشتو کے علاوہ سندھی فارسی اور دیگر زبانوں کو بھی تعلیمی زبان قرار دیا۔ ایک بلوچی کہاوت ہے چوہا خود اپنے بل میں مشکل سے گھس سکتا مگر اوپر سے اس نے ایک چھج بھی دم سے باندھ لی، یعنی بگاڑنے والی بات۔ ایک بار برطانوی وزیر تعلیم پاکستان آئے انہیں ایک گرائمر سکول کا معائنہ کرایا گیا۔ معائنہ کے بعد ان سے تاثرات پوچھے گئے۔ اس نے کہا اگر میں واپس جاکر حکومت کو تجویز دوں کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم انگریزی کی بجائے ایک غیر زبان میں دی جائے تو یقیناً میرا نفسیاتی معائنہ کرانے کی تجویز دی جائیگی۔ ایسی مثالوں کے باوجود ہم ماضی کے غلط فیصلوں پر نظر ثانی کے لئے تیار نہیں۔ WHO کا ذیلی ادارہ برائے تعلیم وثقافت یونیسکو برسوں کی ریسرچ کے بعد کہتی ہے، "مادری زبان میں تعلیم بچوں کا بنیادی حق ہے"۔ یعنی اس زبان میں بچوں کے تعلیم کی ابتدا ہو جو وہ پہلے سے جانتے ہیں۔ اس سے نہ صرف سکول چھوڑنے (Drop-Out) کی شرح کم ہوتی ہے بلکہ وہ بچے جو سکول سے باہر ہیں، انہیں سکول تک لانے کا یہی واحد ذریعہ ہے۔ مادری زبان میں تعلیم پانے والے بچوں میں عمیق سوچ اور عمل کرنے کی صلاحیت بہ نسبت ان بچوں کے جنکی ابتدائی تعلیم کسی دوسری زبان میں ہوئی ہو، سے بہتر ہے"۔ سکول میں تعلیمی زبانیں ایک زینے کی مانند ہونی چاہئیں۔ ابتدا مادری زبان سے چند سال بعد قومی زبان اردو اس کے بعد انگریزی۔

21 فروری مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کا دن

جب دستور ساز کمیٹی نے جنوری 1952 میں اردو کو پاکستان کا واحد قومی زبان قرار دینے کی سفارش کی تو اس کے رد عمل میں 21 فروری 1952 کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلباء نے بنگالی زبان کو اردو کے ساتھ قومی زبان کا درجہ دلانے کی خاطر جلوس نکالا جس پر پولیس نے فائرنگ کی اور 5 طلبا شہید ہو گئے۔

اگلے دن شہدا کے جنازے کے جلوس پر پھر فائرنگ کی گئی اور 4 طلباء مزید شہید ہو گئے۔اس وقت پاکستان میں بنگالیوں کی تعداد 54 فیصد اور اردو بولنے والوں کی تعداد صرف 4 فیصد تھی۔1988 میں کینیڈا کے رہنے والے ایک بنگالی رفیق الاسلام نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوفی عنان کو خط لکھ کر استدعا کی کہ اقوام متحدہ کو دنیا میں مادری زبانوں کو بچانے کے لئے اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے۔

اقوام متحدہ نے اس تجویز کو منظور کرتے ہوئے 21 فروری (ڈھاکہ یونیورسٹی میں طالب علموں کے شہادت کا دن) مادری زبانوں کا عالمی دن قرار دے دیا۔اب اقوام متحدہ کی جانب سے ہر سال مادری زبانوں میں تعلیم کی اہمیت جتانے اور بہت سی زبانوں (جو معدوم ہونے کے خطرات سے دوچار ہیں) کو بچانے کی خاطر یہ دن منایا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں بھی مادری زبانوں کو اپنا جائز مقام دلانے کا مسئلہ حل طلب ہے۔پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 251 کلاز 3 میں مقامی (مادری) زبانوں (Indigenous languages) میں تعلیم اور انہیں اردو کے ساتھ ساتھ صوبائی زبان کا درجہ دلانے کا اختیار صوبائی حکومتوں کو دیا گیا ہے۔سندھ میں اس

آرٹیکل پر عمل ہورہاہے۔ خیبر پختونخوا میں صوبے کے تمام زبانوں کولازمی مضمون کادرجہ دیکر اسکولوں میں پڑھایاجارہاہے۔

یہ بلوچستان کی صوبائی حکومت، ادیبوں، دانشوروں، اکیڈمیز، طلبا تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں کی کم فہمی ہے کہ نہ تو وہ اپنی زبان کو تعلیمی اور نہ صوبائی زبان کی حیثیت دلا سکے۔ پاکستان میں جو زبانیں مٹنے کے حقیقی خطرے سے دوچار ہیں ان میں بلوچی اور براہوئی دونوں شامل ہیں۔

اسکی چار بڑی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ بلوچوں کی آبادی کم ہے اور وہ وسیع بلوچستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ملک کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ان میں تعلیم کی کمی ہے اور وہ شدید غربت، پسماندگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بلوچی، براہوئی زبانوں کو ایران، افغانستان اور پاکستان میں کہیں بھی، تعلیمی اور نہ صوبائی سرکاری زبان کادرجہ حاصل ہے۔

تیسری وجہ ان زبانوں کی اپنی مارکیٹ کا نہ ہوناہے، کوئٹہ، زاہدان، کراچی، ڈیرہ غازی خان اور جیکب آباد گو کہ بلوچ علاقے ہیں لیکن یہاں دوسری زبانیں حاوی ہیں۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ بلوچی، براہوئی کی ہمسایہ زبانیں جیسے فارسی، پشتو، پنجابی، سندھی، ریاستی اور منڈی کی زبانیں ہیں، اسی لئے بلوچستان کی سرحدوں میں رہنے والے بلوچ اپنی زبان ترک کرکے منڈی اور ریاستی زبان اپنانے پر مجبور ہیں۔

زبان کی یہ تبدیلی (Convertion) ہمیں سندھ، پنجاب، ایران اور افغانستان میں لاکھوں کی تعداد میں بلوچوں کی سندھی، پنجابی، فارسی اور پشتو اپناتے دکھائی دیتی ہے اور یہ عمل دھیرے دھیرے غیر محسوس انداز میں ہنوز بھی جاری ہے۔

کسی زبان کو بچانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اسے تدریسی زبان کا درجہ دیا جائے۔اقوام متحدہ نے تعلیمی اور لسانی ماہرین کی کئی سالہ مشترکہ ریسرچ کے بعد اعلان کیا کہ "مادری زبان تعلیم کے لئے سب سے اچھی زبان ہے"۔

اس کے مطابق بچے جب اپنی مادری زبان میں تعلیم کی ابتدا کرتے ہیں تو اجنبیت محسوس نہیں کرتے وہ اسکول کے ہر عمل میں دلچسپی لیتے ہیں اور انکی خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ماہرین کے مطابق مادری زبان کی تعلیم سے اسکول چھوڑنے کی شرح کافی کم ہو جاتی ہے۔

یونیسکو کہتی ہے آج دنیا میں 130 ملین سے زیادہ بچے اسکول سے باہر ہیں مادری زبان ہی انکی تعلیم تک رسائی کی بنیادی حکمت عملی ہے۔مادری زبان کی بجائے دوسرے زبان میں اگر تعلیم کی ابتدا ہو تو بچے کو یہ پیغام مل جاتا ہے کہ اسکی اپنی زبان کمتر ہے،یعنی اس میں تعلیم نہیں دی جاسکتی اسلئے اسے دوسری زبان میں تعلیم دی جارہی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ منفی پیغام بھی مل رہا ہوتا ہے کہ وہ خود کم تر ہے اور جس ثقافتی سرمائے سے اسکا تعلق ہے وہ دراصل سرمایہ نہیں بلکہ شرمندگی کا بوجھ ہے جو وہ اٹھائے پھرتا ہے۔اس کے علاوہ یونیسکو کے مطابق مادری زبان میں تعلیم سے بچوں کی تخلیقی اور تحقیقی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے اور وہ دوسری زبانیں جیسے انگریزی،اردو دوسرے بچوں کے نسبت جو تعلیم کی ابتدا کسی اور زبان میں کرتے ہیں، بہتر سیکھ سکتے ہیں۔

یونیسکو کہتی ہے:

(Years of research have shown that children who begins their education in their mother tongue make a better start

and continue to perform better than those for whom school start with a new language. This conclution is now widly implemented, although we still hear of Governments who insist on imposing a foreign language of instruction on young children, either in a mistake attempt at moderanity or to express the pre-eminence of a social dominant group.)

"برسوں کی تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ جو بچے اپنے مادری زبان میں تعلیم کی ابتدا کرتے ہیں شروع سے ہی انکی کارکردگی بہتر ہوتی ہے اور انکی یہ اچھی کارکردگی مسلسل قائم رہتی ہے، بہ نسبت ان بچوں کے جو اپنی تعلیم ایک نئی زبان سے شروع کرتے ہیں۔ اب اس نتیجہ پر ہر کہیں عمل ہو رہا ہے۔ اگرچہ ہم اب بھی ایسی حکومتوں کے بارے سنتے ہیں جو بچوں پر دوسری زبان تھوپنے پر اسرار کرتے ہیں۔ وہ ایسا یا تو غلطی سے جدیدیت کی خاطر کر رہے ہوتے ہیں یا سماجی طور پر حاوی گروہ کی زبان کو فوقیت دینے کی خاطر۔"

بلوچ تین بڑی زبانیں بلوچی، براہوئی اور سرائیکی بولتے ہیں۔ لاسی، کھیترانی، سرائیکی ایسے قریب ہیں جیسے سلیمانی، مکرانی اور رخشانی بلوچی ہیں۔ اس کے علاوہ دہواری اور سندھی بھی بولی جاتی ہے، بلوچی آپس میں رابطے کی زبان ہے۔

ماہرین کے مطابق دنیا کی ثقافتی صورت ایک خوبصورت قالین کی مانند ہے ایک زبان کے مٹ جانے کے معنی قالین کے ایک رنگ کا اتر جانا ہے۔ زبانیں قومی بقا اور شناخت (Identity) کی ضامن ہیں، ان میں تاریخ، ثقافت، اقدار، روایات اور ادراک (Wisdom) کا ایک بے بہا خزانہ موجود ہے۔

بلوچی زبان اور ریڈیو پاکستان

23جولائی2000ءبروز اتوار ایک مقامی روزنامہ میں یہ خبر چھپی کہ چیف ایگزیکٹو جناب جنرل پرویز مشرف کی خصوصی ہدایت پر تربت ریڈیو سٹیشن میں100 کلوواٹ کاٹرانسمیٹر نصب کیاجارہاہے جس سے ملکی نشریات کو سٹل اور ملحقہ علاقوں تک پہنچانا مقصود ہے۔ محترم جنرل صاحب کے اس دانشمندانہ فیصلے سے نہ صرف ہماری سیاسی، تجارتی اور قومی مفادات کاتحفظ ہوگا بلکہ بلوچی زبان کو جو وقت ملے گا اس سے بلوچی زبان وادب کی ترقی ہوگی اور دور دراز رہنے والے بلوچ پہلی بار بلوچی نشریات سن سکیں گے اس وقت بلوچی زبان میں نشریات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سبی، تربت، ژوب، ریڈیو سٹیشنز میں چوتھائی کلوواٹ کے پاکٹ ٹرانسمیٹر نصب ہیں جن کی نشریات 8سے10 کلومیٹر تک سنی جاتی ہیں کوئٹہ ریڈیو اسٹیشن کی مشینری کافی پرانی اور زائدالمعیاد ہونے کی وجہ سے اس کی نشریات بمشکل 50سے 60 کلومیٹر تک سنی جاتی ہیں جبکہ بلوچستان کارقبہ تین لاکھ سینتالیس ہزار ایک سونوے کلومیٹر ہے۔ ظاہر ہے یہ نشریات پانچ فیصد آبادی تک بھی بمشکل پہنچ پاتی ہیں۔ خضدار ریڈیو اسٹیشن کی روزانہ نشریات صرف چھ گھنٹے کی ہوتی ہیں بلوچی کو آدھا گھنٹہ صبح اورآدھا گھنٹہ شام دیا جاتا ہے جو کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلوچی زبان کو پسماندہ رکھنے میں کئی عوامل کارفرماہیں ایک مکتبہ فکر جس کی حکمران حلقوں میں کافی اثر رسوخ ہے ابھی تک اپنے پرانے موقف پر قائم ہے کہ بلوچی پشتوپنجابی اورسندھی زبان وادب کی ترقی قومی یکجہتی کے منافی ہیں جس کی وجہ سے بلوچی زبان گذشتہ پچاس برس حکومتی سرپرستی سے محروم چلی آرہی ہے

افغانستان میں طالبان نے ریڈیو کابل سے بلوچی پروگرامز بند کر دیئے حالانکہ وہاں سے بلوچی میں مذہبی پروگرامز نشر ہو سکتی تھیں۔ ریڈیو زاہدان سے بلوچی نشریات بمشکل سنائی دیتی ہیں۔ بلوچی ایسے زبانوں میں گھری ہوئی ہے جو سرکاری اور ریاستی زبانیں ہیں سندھیوں کی اپنی زبان سے بے پناہ محبت اور قربانیوں کی وجہ سے سندھی زبان کی حیثیت اپنی جگہ مستحکم ہے۔ ایک اور وجہ بلوچوں کی اپنی منڈی (Market) کا نہ ہونا ہے بلوچ ہمسایہ منڈی کا رخ کرتے ہیں اور مارکیٹ کی زبان سیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں اس طرح پشتو، فارسی، سندھی اور سرائیکی زبانیں بلوچی زبان کو تیزی سے چاٹ (Eroid) رہی ہیں دوسری اہم وجہ بلوچوں کا اپنی زبان سے محبت کا نہ ہونا بھی ہے عام طور پر وہ بلوچی زبان و ادب کی ترقی و خدمت سے ناواقف اور لاتعلق دکھائی دیتے ہیں زبان کی سلامتی اور اسے زندہ رکھنے کے لئے سب سے اہم اور واحد قوت زبان بولنے والوں کا اپنی زبان سے محبت ہے۔

1998ء کی مردم شماری کے مطابق سبی، نصیر آباد ڈویژنز کی آبادی بیس لاکھ تھی جس کی غالب اکثریت بلوچی بولتی ہے اسی مردم شماری کے مطابق جیکب آباد اور اندرون سندھ بائیس لاکھ بلوچ اب بھی بلوچی بولتے ہیں۔ ملحقہ ڈیرہ غازی خان اور راجن پور اضلاع کے دامان اور پہاڑی علاقوں میں بلوچی بولی جاتی ہے لیکن مشرقی بلوچستان، سندھ اور پنجاب کے ان بلوچوں کے لئے ملک کے کسی بھی ریڈیو اسٹیشن سے بلوچی میں پروگرامز نشر نہیں ہوتے کوئٹہ اور خضدار ریڈیو سٹیشن کی نشریات کافی دور ہونے کی وجہ سے ان علاقوں میں نہیں سنائی دیتیں۔ اکیسویں صدی میں اتنی بڑی آبادی کو ریڈیو نشریات سے ہی محروم رکھنا نہ صرف ملکی آئین و قانون کی توہین ہے بلکہ بنیادی انسانی حقوق کی بھی خلاف ورزی ہے۔ انہیں بلوچی سننے کے لئے آل انڈیا ریڈیو کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے حکام کو چاہئے کہ

ملتان اور خیر پور ریڈیو سٹیشنز سے بلوچی نشریات شروع کریں۔ سبی ریڈیو سٹیشن میں ہائی پاور ٹرانسمیٹر نصب کریں تاکہ یہاں سے بلوچی، براہوئی، سرائیکی اور دیگر زبانوں سے نشریات کا آغاز ہو اس وقت سبی ریڈیو سٹیشن سے اسلام آباد کی اردو نشریات ریلے ہوتی ہیں جو آٹھ، دس کلومیٹر تک ہی سنی جاسکتی ہیں۔

زبان اور اس کا ادب انسان کی پہچان ہے اور ہزاروں برس کی انسانی کوششوں کا مشترکہ ثمر ہے بلوچی میں مذہب، تاریخ اور ادب کا عظیم سرمایہ محفوظ ہے اگر بلوچی زبان کے لئے فضا اسی طرح ناموافق رہی تو اسے معدوم ہونے کا شدید خطرہ ہے۔ آج بلوچی زبان اپنی بقاء کی خاطر اپنے بولنے والوں اور زبان و ادب سے محبت کرنے والوں کی توجہ کا بے چینی سے منتظر ہے۔

حصہ دوئم

(تراجم)

Languages and identity are linked as the term mother tongue implies,a healthy identity balances different expects of our personality A community expresses part of its identity in its language of instruction,and a healthy society makes choices that promote harmonious communities and confidential individuals.(UNESCO)

جہاں تک مادری زبان کا تعلق ہے زبان اور شناخت آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ ایک تندرست شناخت ہی ہماری شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو متوازن رکھتی ہے۔ ہر کمیونٹی اپنی شناخت کے ایک حصے کا اظہار بولی جانے والی زبان میں کرتی ہے ایک صحت مند سوسائٹی "انتخاب" کے حق کا احترام کرتی ہے۔ جس سے ہم آہنگ کمیونٹیزاور پر اعتمادافراد کی پرورش ہوتی ہے۔

یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل مسٹر ماٹسورا کا پیغام

آنے والی دہائیوں میں بنی نوع انسان کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا انکا مقابلہ کرنے کے لئے زبانوں کی فیصلہ کن اہمیت سے اقوام متحدہ مکمل آگاہ ہے۔اسی لئے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے سال ۲۰۰۸ کو زبانوں کا سال قرار دیا۔زبانیں افراد اور گروہوں کی شناخت ان کے درمیان پر امن بقاء باہمی کے لئے بے حد اہم ہیں۔ یہ پائیدار ترقی، مقامی اور بین الاقوامی سطح پر لوگوں کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم کرنے کی جانب پیش رفت کے لئے بھی بنیادی حکمت عملی ہیں۔ "تعلیم سب کے لئے" کے چھ مقاصد اور میلینیم ڈیویلپمنٹ گولز (Millennium Development Goals)(جن پر اقوام متحدہ ۲۰۰۲ء میں متفق ہوئی) کے حصول کے لئے زبانوں کا کردار بے حد اہم ہے۔چونکہ زبانوں کا کردار سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں کلیدی ہے،اس لئے بے انتہا غربت اور بھوک کے خاتمے (ایم ڈی جی (1))میں یہ بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔یونیورسل پرائمری تعلیم (ایم ڈی جی (2)) برائے علم و آگاہی اور کامیاب زندگی کے ہنر کے حصول کے لئے زبانوں کا کردار نبیادی ہے۔ایچ آئی وی / ایڈز،ملیریا اور دوسری بیماریوں (ایم ڈی جی (2)) کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ متعلقہ کمیونٹی (جس میں کام ہو رہا ہو) کی آگاہی کے لئے انکی زبان استعمال ہو۔علم و ادب کی حفاظت اور ماحول کی بر قراری (ایم ڈی جی (2)) کی ضمانت حقیقی طور پر مقامی اور دیسی زبانوں سے جڑی ہوئی ہے۔

جیسا کہ ثقافتی تنوع (Diversity) کے بارے یونیسکو کا عالمی اعلامیہ اور لائحہ عمل ۲۰۰۱ء اور ثقافتی ورثہ کی حفاظت، ثقافتی تنوع کے اظہار کی حوصلہ افزائی و ترقی کی کنونشن ۲۰۰۵ء میں بیان ہوا کہ ثقافتی تنوع لسانی تنوع سے منسلک ہے۔ بحر حال چند

پشتوں میں سات ہزار زبانوں (جو دنیا میں آج بولی جارہی ہیں) میں سے پچاس فیصد سے زیادہ ختم ہوسکتی ہیں۔ فی الوقت ان میں سے ایک چوتھائی سے بھی کم سکولوں اور سائیبر سپیس میں استعمال ہورہی ہیں اور وہ بھی کبھی کبھار۔ ہزاروں زبانیں نظام تعلیم، میڈیا، پریس، اور عوامی حلقوں (Public Domain) سے غائب ہیں اس کے باوجود کہ انکے بولنے والوں کو ان پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ کیسے؟ ہمیں زبان کے بارے ایسی حکمت عملی اور پالیسیاں تشکیل دینی چاہئیں جو ہر کمیونٹی کی حوصلہ افزائی کرے اور اسے اس قابل بنائے کہ وہ اپنی مادری زبان کو جتنا ممکن ہو بشمول تعلیم کے وسیع پیمانے پر اور اکثر اوقات استعمال میں لاسکے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک قومی یا علاقائی اور ایک بین الاقوامی زبان پر بھی عبور حاصل کرے اور اسی طرح حاوی زبان بولنے والوں کو ایک قومی یا مقامی اور ایک بین الاقوامی زبان پر مہارت حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی ہو۔ ہماری گلوبل دنیا میں تمام زبانیں صرف اس وقت اپنی مناسب مقام پاسکیں گی جب کثیر اللسانیت کو مکمل طور قبول کرلیاجائے گا۔ اسی لئے یونیسکو حکومتوں، اقوام متحدہ اور سول سوسائٹی کی تنظیموں، تعلیمی اداروں، پیشہ ورانجمنوں اور تمام وابستہ لوگوں کو دعوت دیتی ہے کی وہ زبانوں اور خاصکر مٹنے کے خطرے سے دوچار زبانوں کی انفرادی اور اجتمائی صورت کا احترام کریں اور انکی ترقی اور تحفظ کی خاطر اپنی کوششیں تیز تر کریں، ایسی کوششیں ان زبانوں میں تعلیم یا سائیبر سپیس میں کام کے آغاز، تعلیمی ماحول عام کرنے، خطرے میں گھری زبانوں کے تحفظ کے منصوبوں، سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں زبانوں کی کردار پر کام، زبان اور معیشت کے مابین تعلق زبان اور تخلیق کے درمیان واسطہ ڈھونڈنے کی صورت ہوسکتی ہیں۔ یہ اہم ہے کہ

"زبان کا مقدمہ" (Language Matter) کی ہر جگہ اور ہر وقت وکالت کی جائے۔

ریاستی گرفت اور بلوچستان میں زبان پر اِسکا اثر

(کارینا جاہانی)

اس مضمون کے لکھنے کا مقصد مشرق وسطیٰ کے سب سے کم زیر مطالعہ گروہوں میں سے ایک "بلوچ" (جو ایرانی لسانی علاقے کے جنوب مشرقی کونے میں آباد ہیں) کے سماجی لسانی حالات کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے یہ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں ریاستی بالادستی کسی حد تک حال ہی میں قائم ہوئی اور جہاں جدید سماج، اس کی زر پرست معیشت، مستقل سکونتی طرز زندگی، عام تعلیم اور حکومتی نظم و نسق وغیرہ اب قائم ہو رہی ہیں۔ بلوچستان جیسے علاقے میں جہاں ابتک لسانی منصوبہ بندی تعلیم، ابلاغ عامہ، اخبار یا سرکاری زبان جیسی کوئی سوچ(Phenomenon)نہ تھی، وہاں زبان سے متعلق ریاستی فیصلوں اور ان پر عملدر آمد کا مطالبہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ بہر حال ایران میں فارسی زبان اور پاکستان میں اردو اور انگریزی نے بلوچستان میں ایک مستقل پھیلتی خطرے کا کردار ادا کرنا شروع کیا۔ جسے کئی بلوچ اپنی زبان اور مخصوص نسلی شناخت کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ بلوچ جدیدیت کے خلاف نہیں لیکن بلوچ دانشور اس مشکل میں ہیں کہ کیسے اپنی زبان اور نسلی تنوع (Diversity) کو بر قرار رکھیں اور ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی گلوبل دنیامیں بھی حصہ دار بنیں۔

تاریخی پس منظر:۔ انیسویں صدی کے آخر میں پاکستان اور ایران کے درمیان کھینچی لکیر جسے گولڈ سمتھ لائن کہتے ہیں بارڈر کمیشن (جس کی سربراہی برطانوی جنرل گولڈ سمتھ کر رہے تھے جس میں تہران اور ریاست قلات کے نمائندے شامل تھے) نے کھینچی تھی۔ یہ لائن قدیم بلوچ سرزمین کو تقسیم کرتی ہے

جس پر دونوں طرف آباد بلوچ ابتداء سے مسلسل اعتراض اور اکثر اوقات اسے نظر انداز کرتے آرہے ہیں۔(Breser2001,133.134)اس لائن نے لسانی مسئلہ پر کافی اثر ڈالا۔اس لئے سرحد کے دونوں اطراف بلوچی زبان کی صورت حال کا مطالعہ دلچسپ ہے۔ بلوچ کے ابتدائی تاریخ کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں لیکن دو بنیادی نظریے(Theories)مشہور ہیں کہ وہ کب اپنی موجودہ جائے سکونت آئے جو جنوب مشرقی ایران، جنوب مغربی پاکستان اور جنوبی افغانستان کے علاقوں پر مشتمل ہے۔مقامی نظریے کے مطابق آرین قبائل کی جاری نقل مکانی کے ساتھ،جو سطح مرتفع ایران پر شمال سے پہلے ہی چڑھائی کر چکے تھے مرکزی بلوچ (Core Baloch) گروہ دو ہزار سال قبل بلوچستان میں آباد ہو کر مقامی لوگوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ہجرتی نظریہ(Imigration Theory)(جسے مقامی جنگی روایات کی پشت پناہی حاصل ہے جنکا تعلق شجرہ نسب کی رزمیہ شاعری اور بلوچ قبائل کی نقل مقانی سے ہے) کے مطابق بلوچ نزدیک دسویں صدی عیسوی کے لگ بھگ شمال مغرب سے بلوچستان آئے۔ حقیقت میں یہ رزمیہ گیت بلوچ کو سامی نسل اور پیغمبر ﷺ سے قریبی رشتہ بتاتے ہیں۔ یہ تھیوری بلوچ کو ایک اچھا اور راسخ العقیدہ مسلمان ثابت کرنے کے لئے بناوٹی تاریخ کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ بلوچ کے دوسرے نسلی تعلق جیسے ترک اور انڈین کی بھی بات ہوئی ہے (Dames1904-7)۔ہو سکتا ہے بلوچ ابتدائی تاریخ میں مختلف قبائل پر مشتمل تھے اور ان میں مشترکہ نسلی احساس نہ ہو(Spooner 1989,607) پھر بھی لسانی شوائد یہی بتاتے ہیں کہ کم از کم ایک مرکزی گروہ(Core Group)غالباً یورپی نسل سے تھا۔ جس نے شمال مغرب سے نقل مکانی کی تھی۔ عرب گروہوں نے شاید اپنا راستہ ان مختلف النسل(Hetrogenous) قبائل میں ڈھونڈا ہو،اور یہ سب

آخر کار باہم مدغم ہو کر کرمان کے مشرق میں بلوچ شناخت بنے۔(Spooner 1987,609)عرب تاریخ دان نویں، دسویں صدی عیسوی سے انکا تعلق کرمان خراسان سیستان اور مکران کے درمیانی علاقوں سے بتاتے ہیں۔ (Spooner1989:606)یہ بھی ممکن ہے کہ بلوچستان میں آباد ہوتے وقت انہوں نے مقامی آبادی کا ایک بڑا حصہ اپنے اندر جذب کیا ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ انہیں ہمسایوں سے الگ رکھنے کے لئے ایک بلوچ نسل کی بات کی جائے۔ (Dames 1904)لیکن ایسے دوسرے عوامل ہیں جو انہیں باہم مربوط اور خطہ کے دوسرے لوگوں سے جدا کرتے ہیں۔ انتھونی ڈی سمیتھ (21;1986)ثابت کرتا ہے کہ ایتھنوز (Ethnos) کی اصطلاح بیالوجی اور خاندانی تفاوت کی بجائے ثقافتی تفاوت کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ان ثقافتی تفاوت میں سے وہ مشترکہ نام، نسب کا ایک مشترکہ افسانوی داستان، مشترکہ تاریخ ،ایک مخصوص مشترکہ ثقافت،ایک خطہ زمین سے وابستگی اور یکجہتی کی سوچ کو شمار کرتا ہے جو نسلی وابستگی کے لازمی اجزا ہیں۔(Smith 1986:22-31)اور بلوچ کے بارے میں یہ تمام صحیح ہیں مشترکہ ثقافت کے اجزا میں سے زبان اور مذہب خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

بلوچی زبان اور سنی مسلک انہیں ہمسایہ نسلی گروہوں سے نمایاں کرنے والے اجزاء ہیں۔اپنے گروہ کااِرد گرد کے دوسرے نسلی گروہوں سے امتیاز کرنے کے قابل ہونا لازمی ہے۔حقیقت میں یہ امتیاز اپنے اور دوسرے گروہوں کے مابین ایسے عملی تعلق (جو الگ محسوس کیئے جائیں) سے ممکن ہے۔ جب اپنے گروہ کاایک مستقل فرق دوسرے گروہ کے مدمقابل ہو تو پھر فائدہ مند ہوتا ہے۔ (see e.g. Erikson 1993)ایران میں سنی مسلک اس لحاظ سے بنیادی ہے جبکہ بلوچی زبان فارسی سے نزدیک ہے اور سرکاری موقف میں عام طورا سے

فارسی کا لہجہ کہا جاتا ہے جبکہ ایران میں اکثریت بلوچ کے برخلاف شیعہ اسلام کے پیروکار ہے۔ دوسری طرف پاکستان میں جہاں بلوچی زبان، سندھی، لہندی، پنجابی، اردو یا دوسری ہندی زبانوں سے قُربت نہیں رکھتی اور مشرقی ایرانی زبان پشتو سے بھی کافی جُدا ہے، زیادہ بنیادی ہے جبکہ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت اور بلوچوں کی بھی بڑی اکثریت سنی اسلام کے پیروکار ہیں۔

روایتی سماجی اقتصادی نظام بلوچستان کو دو حصوں شمال اور جنوب میں تقسیم کرتی ہے۔ شمال میں مالداری اور خانہ بدوشی رہن سہن کا غالب حصہ رہا ہے، جبکہ جنوب میں زراعت، اور جہاں بہت کم زمیندار، بے زمین مزدور یا غلام ملتے رہے ہیں۔ بلوچستان میں ہر جگہ قبائلی نظام ہی آزاد منش بلوچ کو تاریخی طور پر متحد رکھنے کی وجہ رہی ہے اور یہ غیر بلوچ قبائل اور چھلیوں کے لئے آسان تھا کہ وہ بلوچ قبائل کے ساتھ گھل مِل جائیں اور انکے قبائلی نظام میں ضم ہوں۔ آجکل قبائلی نظام بہ نسبت اِن علاقوں کے جہاں مالدار خانہ بدوش رہتے ہیں، بلوچستان کے ان علاقوں میں جہاں روایتی معیشت بندوبستی زراعت (Settled Agriculture) پر مبنی ہے تیزی سے زوال پذیر ہے۔ اب یہ بھی سمجھا جا رہا ہے کہ قبائلی وفاداریاں مضبوط قومی تحریک کے لئے رکاوٹ ہیں۔ بہت سے بلوچ دانشور قبائلی وفاداریوں کو عام بلوچ قومی وفاداری میں بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (Smith 1986:21)

سترھویں صدی عیسوی میں بلوچوں نے علاقے کے دوسرے طاقتوں کے مقابلے میں براہوئی قبیلے کے ساتھ اتحاد کیا۔ یہ بلوچ، براہوئی خانیٹ جسکا مرکز قلات (آجکل کے پاکستان میں) تھا، 1948ء تک قائم رہا۔ یہ خانیٹ اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف نصیر خان اوّل کے دور میں کافی طاقتور ہو گیا تھا۔ نصیر

خان واحد خان تھا جو اپنے لوگوں کی وفاداریاں قبائل سے بلند کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔(Sponer 1989:611) لیکن بعد میں یہ ریاست کمزور پڑ گئی اور 1839ء میں اسے برطانوی انتظام میں شامل کیا گیا۔ قلات کی سرکاری زبان شروع سے فارسی تھی۔(Baloch 1987:120) لیکن بعد میں دفتری مقاصد کے لئے انگریزی نے فارسی کی جگہ لے لی۔

اُنیسویں صدی میں تہران کے قاچار شاہوں نے بلوچستان کے مغربی حصوں کو مطیع کرنے کی کئی کوششیں کیں۔ اسی طرح برطانوی ہند بلوچستان کے مغرب میں پیش قدمی کی خواہشمند تھی۔ یہ گولڈ سمتھ بارڈ کمیشن کا پس منظر ہے اور اسکی حدبندی سے اکثر بلوچ وطن برطانوی ہند اور ایران میں تقسیم ہو گئی۔ اس کے باوجود قاچار کبھی بھی بلوچستان پر اپنی طاقت قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ بعد میں 1928ء کی بات تھی جب نئی قائم ہونے والی پہلوی بادشاہت نے صوبے میں بالواسطہ کنٹرول حاصل کر لی۔

سرکاری لسانی پالیسی، تعلیم اور ذرائع ابلاغ کا اثر:

جدید دَور سے قبل بلوچستان میں تعلیم روائتی اسلامی مدرسوں پر منحصر تھی۔ اس سسٹم میں بلوچی زبان اور لٹریچر کی تعلیم ممکن نہ تھی اور نہ بلوچی لٹریچر لکھنے کی پہلے کوئی روایت تھی کہ جس سے استفادہ کیا جاتا۔ استعمال ہونے والی زبانوں میں ایک عربی تھی جو مذہب اور سائنس کی زبان تھی اور دوسری فارسی جسکی لمبی اور بلند ادبی تاریخ تھی۔ جدیدیت کے ساتھ سیکولر تعلیمی نظام اور قوم پرستی کا نظریہ پہلے برطانوی ہند اور پھر ایران پہنچا۔ حسین بر کے خیال میں سُست روی سے شہری زندگی اپنانا(Slow Pace of Urbanization) سماجی اور معاشی زندگی میں جدیدیت کا فقدان اور 1960ء کی دہائی سے پہلے محدود حد تک جدید تعلیم کا متعارف ہونا وہ وجوہات ہیں جنکی وجہ سے بلوچ قومی تحریک کے سیاسی، لسانی اور ثقافتی مطالبات مشرقی بلوچستان (پاکستانی) کی نسبت مغربی بلوچستان (ایرانی) میں بہت سُست رفتاری سے آگے بڑھ پائے۔ اسکے علاوہ متشدد پہلوی حکمرانی بھی ایک وجہ تھی(Haussinbor 200:150) جب برطانوی ہند میں نو آبادیاتی زنجیریں توڑنے اورآزادی کے مطالبات زور پکڑنے لگے تو بہت سے تعلیم یافتہ بلوچ بھی آزاد بلوچستان کا مطالبہ کرنے لگے ان قوم پرستوں میں کچھ شاعر اور ادیب بھی تھے جنہوں نے بلوچی ادبی تحریک میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انگریزوں نے پہلے ہی بلوچی زبان پر کافی توجہ دی ہوئی تھی۔ اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع سے بلوچی زبان کے مختلف لہجوں کی بہت سی گرائمر تشریح اور ڈکشنری کی کتابیں آچکی تھیں۔ ایم لانگ ورتھ ڈیمز نے بلوچی زبانی رزمیہ شاعری، لوک داستانیں اور کہانیاں وغیرہ جمع کرکے شائع کیں۔ اِس نے بلوچی زبانی ادب (Oral literature) پر بڑی تحقیق کی اور اِسے محفوظ کرکے بلوچی کی بڑی خدمت کی۔ بلوچی میں امتحان بھی منعقد ہوتے تھے۔ نو آباد کار سرکاری اہلکاروں کو بلوچی سیکھنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔(Bruce 1900:69)۔

1930 کی دہائی کے بعد جب قوم پرست نوجوانوں نے بلوچی میں شاعری، مضامین اور دوسرے ادبی کام کرنے شرع کیئے تو پہلے سے موجود ان تحریروں سے انہیں مدد ملی۔ 1950ء کے وسط سے بلوچی میں کتابوں اور جرائد کی اشاعت کی اہمیت کو کبھی بھی کم نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہ اشاعت بھی کئی لحاظ سے بہت محدود ہیں۔ ایک تو علاقائی لحاظ سے اِن کی تقسیم زیادہ تر پاکستان تک محدود ہے۔ دوسرے اِن کے پڑھنے والوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ تمام تعلیم یافتہ بلوچوں نے اپنی تعلیم اردو، انگریزی (پاکستان) فارسی (ایران اور افغانستان) یا دوسری زبانوں جیسے عربی (خلیجی ریاستوں) میں حاصل کی۔ اِس کے علاوہ بلوچی ادبی تحریک کا انحصار مکمل طور پر ذاتی پہلکاریوں پر ہے۔ اِسے ذرا برابر سرکاری مدد حاصل نہیں۔اِس لئے ایک چھوٹی سی ادبی اشرافیہ بلوچی کتب اور رسائل پڑھنے میں دلچسپی رکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں مالی مشکلات در پیش ہیں (see e.g. Dashtyari 2003) پاکستان میں انتظامی اور تعلیمی میدانوں میں سرکاری سطح پر بلوچی استعمال نہیں ہوتی۔ اگرچہ بلوچی کو تعلیمی زبان قرار دینے کے لئے آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ پاکستان میں بلوچی کو جو سرکاری مدد حاصل ہے اِس میں بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں پڑھانا، ایک اکیڈمی ''بلوچی اکیڈمی'' جس کی بنیاد 1961ء میں رکھی گئی اور ریڈیو، ٹی وی سے بلوچی نشریات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وزارت اطلاعات و نشریات کی جانب سے ایک میعادی (Periodical) رسالہ ''اولس'' کا کوئٹہ سے اجراء بھی شامل ہے۔ 1990ء کے عشرے کے شروع میں پاکستانی بلوچستان کے اِن علاقوں میں جہاں بلوچی بولنے والوں کی اکثریت ہے، پرائمری تک بلوچی پڑھانے کے اقدامات کیئے گئے تھے۔ بہر حال کئی وجوہ کی بنا یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہیں رہا۔ اِن میں بلوچوں کا اِملا کے مسئلے پر متفق نہ ہونا اور تجربہ کار اساتذہ کی کمی شامل تھی جو وجوہ زیادہ اہم تھا وہ شاید بلوچی بولنے والوں کا اپنی زبان کے بارے میں روّیہ ہے۔ بلوچی کو کئی بلوچ خود ایک پسماندہ اور

دیہاتی زبان کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اِن کے خیال میں آج کے پاکستان میں بلوچی میں تعلیم سماجی اور معاشی حیثیت کی بہتری میں مدد نہیں دے سکتی۔ اسی طرح لوگ اِس بات سے بھی خوفزدہ تھے کہ بلوچ اور بروہی کو مختلف زبانوں میں پڑھایاجائے گا۔ اگرچہ سیاسی اتحاد کی وجہ سے ریاست قلات میں اِن کی شناخت بالکل ایک تھی۔ بروہی اکثریت سے دو زبانیں، براہوئی اور بلوچی بولتے ہیں۔ (Farrell 2000--24-25)

گو کہ ثقافتی ماحول برطانوی ہند اور بعد میں پاکستان میں بلوچی ثقافتی ادبی تحریک کے لئے مکمل طور پر منفی نہ تھا لیکن گولڈ سمتھ لائن کی دوسری جانب حالات بالکل مختلف تھے۔ پہلوی شاہوں کی لِسانی اور ثقافتی پالیسی مکمل طور پر اکثریتی تھی۔ علاقائی رسم ورواج' روایات اور ثقافتوں کو مضبوط کرنے کی تمام کوششیں قوم دشمنی اور ایرانی سالمیت کے لئے خطرہ سمجھی جاتی تھیں۔ خاص طور پر وہ زبانیں جو ایرانی سرحدوں کے اندر بولی جاتی تھیں اور جو فارسی سے قربت رکھتی تھیں (ایرانی زبانیں)۔ انہیں فارسی کے مقامی لہجے کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ایسی صورتحال میں حکومت کی جانب سے مادری زبان میں تعلیم، حتیٰ کہ ثقافتی سرگرمیاں یا اقلیتی زبانوں میں جرائد کی اشاعت کے لئے سہولیات کیسے ممکن ہو سکتی تھیں۔ موجب اور حسن بر اِس لسانی اور ثقافتی قبضہ گیریت کو نسل پرستی اور قومی تنگ نظری کی جھوٹی داستانیں اور پروپیگنڈہ کہہ کر اس منفی سوچ کو سرکاری سرپرستی میں ریاستی میڈیا' تعلیمی اداروں (جو تمام ریاستی ملکیت ہیں) اور اخبارات کے ذریعے پھیلانا قرار دیتے ہیں اور اِن کے مطابق اِسکا مقصد ایران میں قومی' لسانی اور ثقافتی تنوع (Diversity) سے انکار کرنا ہے۔ (Mojab and Hassanpour 1995:231-232) اسلامک ریپبلک آف ایران کے آئین کے چیپٹر ا، آرٹیکل 15 کے مطابق سرکاری زبان فارسی کے علاوہ علاقائی اور قومی زبانوں کا پریس اور ذرائع ابلاغ میں استعمال اور اِن کے لٹریچر کا

سکولوں میں پڑھانے کی اجازت ہے (Algar:1980:34) اِس کے معنی ہیں قانونی طور پر بلوچی میں کُتب اور اخبارات کے اشاعت کی اجازت ہے۔ لیکن موجودہ وقت مشکل سے ایران میں کوئی ایسا کام ہورہا ہے۔ جہاں تک سکولوں میں بلوچی لٹریچر پڑھانے کی بات ہے' تحریری بلوچی لٹریچر تقریباً ناپید ہونے کی وجہ سے ایسے مضمون کے لئے کسی سہولت کی کوشش نہیں ہورہی ہے۔

ایران میں پہلی بار بلوچی میں اشاعت اسلامی انقلاب کے بعد ممکن ہوئیں (1979-1980) کئی میگزین چند مہینوں کے لئے نظر آئے لیکن اِن کی اشاعت کو جلد بند ہونے پر مجبور کیا گیا۔ 1990ء کی دہائی کی آخر میں بلوچی میں اشاعت پھر بحال ہوئیں۔ موجودہ وقت دو زبانوں یعنی بلوچی اور فارسی میں دو میگزین ایک ایران شہر اور دوسری زاہدان سے شائع ہورہی ہیں۔ جہاں تک ریڈیو پروگرامز کا تعلق ہے حالات مختلف ہیں۔ ریڈیو زاہدان سے روزانہ بلوچی پروگرامز نشر ہورہی ہیں۔ حقیقت میں یہ نشریات 1960ء کی دہائی سے یعنی پہلوی بادشاہت کے وقت سے جاری ہیں۔ اِن نشریات کے مواد کو عام طور پر بلوچ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اِسے بلوچی زبان کی حقیقی خدمت کی بجائے سرکاری پروپیگنڈہ خیال کرتے ہیں۔ ایران میں ٹی وی پر بلوچی نشریات کے لئے کوئی سہولت پیدا نہیں کی جارہی۔

ایران میں ریاست تعلیم، انتظامیہ، ابلاغِ عامہ اور اشاعت وغیرہ کے لسانی میدانوں کو بھی اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ اِس لئے زبان کے اِن میدانوں (Domains) میں مکمل یا تقریباً فارسی استعمال ہوتی ہے۔ ریاست کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ وہ بلوچی زبان کی ترقی کی خاطر متحرک اقدامات اُٹھائے اور اِسے اِتنا طاقتور بنائے کہ میڈیا' تعلیم اور انتظامی سطح پر اُس کا استعمال ہو۔ اِس کی وجہ اِن کی یہ شدید خوف ہے کہ ثقافتی خودمختاری کی تحریک جلد سیاسی تحریک میں بدلے گی اور آزادی کے مطالبے شروع ہونگے۔

موجودہ حکومت کے حق میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِس نے پہلوی بادشاہت کے مقابلے میں کثیر الثقافتی کی زیادہ اجازت دے رکھی ہے۔ ٹی وی پروگراموں میں علاقائی رنگ جیسے 'رقص' لباس اور رسم و رواج عام نشر ہوتی ہیں۔ چابہار جہاں بہت سے بلوچ ثقافتی میدان میں متحرک ہیں۔ انہیں "شام شعر و شاعری" کی اجازت دی گئی۔ جس میں وہ بلوچ روایات اور جدید شاعری پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ فارسی اور بلوچی میں دوزبانی میگزینز بھی ایک مثبت عمل ہے۔ دوسری اقلیتی زبانوں آزربائیجانی اور کردش میں کافی تعداد میں کتب اور اخبارات کی اشاعت ہو رہی ہیں۔ ایران میں پہلی بار تبریز سے آزربائیجانی زبان اور ثقافت اور سنندج سے کردش زبان اور ثقافت میں بی اے (B.A) پروگرامز کی ابتداء تعلیمی سال 05-2004ء سے ہوئی۔ رشت یونیورسٹی میں گیلان سٹڈیز کا بھی ایک شعبہ قائم ہے۔

پاکستان میں تعلیم، انتظامیہ اور میڈیا میں بلوچی کا استعمال بہت محدود ہے۔ پھر بھی اِتنا محدود نہیں جتنا کہ اِس وقت ایران میں ہے۔ بلوچی عام طور گھروں میں یا اپنی برادری (عزیز و اقارب، ہمسایوں، دوستوں وغیرہ) کے ساتھ بولی جاتی ہے اور کبھی کبھار کام کے دوران بھی بلوچی بولی جاتی ہے۔ جہاں تک مذہب کی بات ہے عربی پڑھنے اور عبادت کی زبان ہے۔ جبکہ وعظ و نصیحت پاکستان اور ایران دونوں ملکوں میں بلوچی بولنے والی برادری کو سمجھانے کی خاطر بلوچی میں کی جاتی ہے۔ بہر حال مجموعی طور پر بلوچی کو روائیتی حلقوں (Domains) کی زبان سمجھا جاتا ہے جو موجودہ سماج میں کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی۔

انتظامیہ اور تعلیم جیسے احترام والے حلقے (Domains) جہاں سماج میں آگے بڑھنے کے مواقع موجود ہیں' بلوچی زبان کے حلقے نہیں ہیں۔ یہاں ریاستی زُبان / زبانوں کا غلبہ ہے۔ اِس لئے بہت سے والدین جو اپنے بچوں کو سماج میں آگے بڑھتا دیکھنے کے لئے بیتاب ہیں۔ بلوچی کی بجائے اِن زبانوں کو ترجیح دیتے

ہیں۔ ایسے حالات میں تعلیم اور سوسائٹی میں آگے بڑھنے کی قربانی دیکر ہی بلوچی کو بچانا ممکن ہو سکتا ہے۔ فارل (2000:20) کا خیال ہے کہ موجودہ وقت میں جزوی طور پر تعلیم کا فقدان ہی بلوچی کو طاقت بخش رہی ہے لیکن تعلیم سے دُوری ایک ایسی صورتحال ہے جسکا جاری رہنا نقصان دہ اور ناممکن ہے۔ ریاستی حکمران اشرافیہ کی خواہش ہوگی کہ بلوچ ناخواندہ ہی رہیں تاکہ وہ جدید سیاسی نظریوں کو نہ اپنا سکیں، لیکن یہ یقینی طور خود بلوچ اکثریت کی خواہش نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ بلوچستان میں شرح خواندگی اب بھی کم ہے لیکن یہ بتدریج بڑھ رہی ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے اور میں نے کئی ایسے لوگوں سے انٹرویو بھی کیئے جو ایرانی بلوچستان میں رہتے ہیں یا جنہوں نے حال ہی میں اُس علاقے کا سفر کیا، یہ بالکل صحیح ہے کہ آجکل وہاں اکثر بچے، بچیاں کم از کم پرائمری تک تعلیم حاصل کرتے ہیں، روایتی طرزِ زندگی زیادہ سے زیادہ جدید طرزِ زندگی کو راستہ دے رہی ہے جو تعلیم کو آسان اور پُرکشش بناتی ہے۔ اِس طرح تقریباً تمام نوجوان نسل زیادہ سے زیادہ 6 سال کی عمر سے جب وہ سکول میں داخلہ لیتے ہیں فارسی سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم پر اسلامی انقلاب کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کے علیحدہ سکول کھلنے اور لازمی نصاب کی وجہ سے سماجی ثقافتی رکاوٹیں کسی حد تک کمزور ہو گئیں۔ دوسری طرف اطلاعات ہیں کہ چھوٹے دیہاتوں میں جہاں کم بچے ہوتے ہیں، بچے اور بچیوں کو ایک کلاس میں پرائمری تک پڑھایا جاتا ہے جس کی وجہ سے پرائمری کے بعد زیادہ بچیاں اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتیں۔

1996ء (آبان 1375 ایرانی ہجری شمسی کیلنڈر) کی مردم شماری کے مطابق سیستان بلوچستان صوبے میں 6 اور 6 سال سے زیادہ شرح خواندگی 57 فیصد تھی۔ جنس کے لحاظ سے خواندگی 49 فیصد خواتین اور 65 فیصد مرد تھے (ایرانی سٹیٹس ٹیکل سالانہ کتاب (1377:2000:603) میں خواندگی کی

تعریف یہ کی گئی ”کہ وہ تمام لوگ جو فارسی یا کسی اور زبان میں سادہ تحریر لکھ اور پڑھ سکتے ہوں، اور وہ بھی جنہوں نے ایک سال پرائمری سکول یا اس کے مساوی پڑھا ہو“ انہیں خواندہ شمار کیا گیا۔ (ایران اسٹیٹس ٹیکل سالانہ کتاب (1377:2000:595) سیستان بلوچستان کے اعداد و شمار کا موازنہ ملک کے اوسط خواندگی کے اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے جو اِسی سال 80 فیصد تھی اور سیستان بلوچستان کے بعد سب سے کم خواندہ صوبہ کردستان تھا جہاں 68 فیصد خواندگی تھی (ایران اسٹیٹس ٹیکل سالانہ کتاب (1377:2000:603) دس سال پہلے 1986ء (مہر 1365 ایرانی ہجری شمسی کیلنڈر) میں سیستان اور بلوچستان میں شرح خواندگی 36 فیصد تھی اور پورے ملک میں شرح خوانگی 61 فیصد تھی (ایران سٹیٹس ٹیکل سالانہ کتاب 1370:1993:123) دوسری وجہ جس نے ایرانی بلوچستان میں فارسی کے اثر کو مضبوط کیا وہ صوبے کو بجلی کی سہولت مہیا ہونا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے سے شروع ہو چکی تھی لیکن اسلامی انقلاب کے بعد اِس پر کام تیز ہوا اور اب تقریباً ہر علاقہ تک اِس کی ترسیل مکمل ہو گئی۔ صوبے میں بجلی کے ساتھ ٹیلی ویژن آیا۔ بہت سے بلوچ مرد حضرات خاص طور بلوچستان کے جنوبی حصوں سے اپنا کچھ وقت خلیجی ریاستوں میں مہمان مزدور کی حیثیت سے گزارتے ہیں جہاں سے وہ بلوچستان میں اپنے خاندان کے لئے بجلی کا سامان جیسے ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ خریدتے ہیں۔ ٹیلی ویژن سب سے پہلے 1960ء کی دہائی میں صوبائی ہیڈ کوارٹر زاہدان میں متعارف ہوئی۔ لیکن اب ٹی وی ایرانی بلوچستان کے اکثر دُور دراز علاقوں تک پہنچ چکی ہے۔ بلوچستان میں فارسی کو متعارف کرانے میں ٹی وی نے سب سے بڑی پیش رفت کی ہے، (کیونکہ ٹی وی سمعی بصری دو طرح

اثر کرتی ہے) بچپن سے یہاں تک کہ سکول جانے سے بھی پہلے فارسی پروگرامز دیکھ کر بلوچ بچے اِس زبان سے متعارف ہو جاتے ہیں اور اِس کا تہرانی تلفظ سیکھتے ہیں۔ جو بڑی نسل کے اکثر تعلیم یافتہ بلوچوں کے لئے ممکن نہیں، جو عام طور فارسی بلوچی تلفظ کے ساتھ بولتے ہیں۔ اِسکی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ سکول میں مقامی اساتذہ کے توسط سے فارسی سے متعارف ہوئے جو خود فارسی سیستانی یا بلوچی تلفظ سے بولتے تھے۔ میرے کئی ایرانی بلوچ دوست یاد کرتے ہیں کہ وہ سکول میں فارسی بولتے شرمندگی محسوس کرتے تھے، خاص کر فارسی بولنے والے کلاس فیلوز کے سامنے جو اِنکی تلفظ کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

ایرانی بلوچی کی ساخت پر فارسی کا اثر:

ایرانی بلوچستان میں بلوچی کے دو بڑے لہجے' مغربی (یارخشانی) جنوبی (یامکرانی) بولے جاتے ہیں۔ یہ دونوں لہجے گولڈ سمتھ لائن کے دونوں جانب بولے جاتے ہیں۔ ایرانی بلوچستان میں ایک علاقہ ساراوان بھی ہے جہاں ایک مخصوص لہجہ (جو بڑی حد تک بلوچی کے دوسرے لہجوں سے زیادہ فارسی سے متاثر ہے) بولی جاتی ہے۔(see also Baranzehi:2003) آجکل یہ بالکل واضح ہے کہ قومی زبان فارسی' سماجی اور ثقافتی لحاظ سے حاوی زبان ہے اور بلوچی کم حیثیت والی ایک دیسی زبان ہے۔ بہر حال ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا۔ ساراوان کی مثال اِسکا مکمل ثبوت ہے۔ ساراوان میں ایک یا دو صدی قبل مقامی سماج میں بلند حیثیت بلوچ قبائل کم حیثیت افغان یا دوسرے فارسی بان نسل کے مہاجر کسانوں (جو بلوچوں سے کافی بعد یہاں آئے تھے) کے ساتھ ساتھ رہتے تھے (Spooner: 1967:56) متصل زبانیں مختلف انداز میں ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں' متاثر کرنا زبان کی نسبت اسکی حیثیت پر زیادہ منحصر ہوتا ہے۔ تقریباً برابر حیثیت والی دو یا زیادہ زبانیں ایک دوسرے کی ساخت اور الفاظ کو متاثر کرتے ہوئے ساتھ ساتھ بولی جاسکتی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ ایک دوسرے کو مٹا نہیں سکتیں۔ اسے ایڈسٹریٹ اثر(Adstrate Influence) کہتے ہیں۔ دوسری صورت وہ ہے جب ایک بالادست زبان جیسے فاتح گروہ یا سیاسی طور بالادست اشرافیہ کی زبان' زیردست زبان جیسے اقلیتی گروہ کی زبان کو متاثر کرتی ہے۔ اِس قسم کے اثر کو سپر سٹریٹ (Superstrate)اثر کہتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ اصطلاح متصل زبانوں کا آخری نتیجہ نکلنے کے بعد بھی استعمال ہوتی ہے' جیسے فاتح اپنی زبان ترک کر کے مقامی زبان اپنائیں' جو بہر حال اِن کی زبان سے کافی حد تک متاثر ہو چکی ہوتی ہے۔ ایسا

نتیجہ اِس وقت زیادہ متوقع ہے جب فاتح تھوڑی تعداد میں ہوں اور ایسے علاقہ میں سیاسی اقتدار پر قبضہ کریں جہاں اِن سے مختلف زبان بولی جاتی ہو۔ جیسے نارمن کا برطانیہ کو تسخیر کرنا۔ بہر حال سپر سٹریٹ (Superstrate) وسیع معنوں میں کم حیثیت والی زبان پر زیادہ حیثیت والی زبان (جو عام طور جبری قبضہ یا سیاسی طور جذب ہونے سے مُسلط کی گئی) کے قابل شناخت اثرات کو بیان کرنے پر بھی استعمال ہوتی ہے (Trask 2000:330)اِس تعریف کے مطابق ایران میں فارسی کی اقلیتی زبانوں پر بناوٹی (Structural) اور لفظی (lexical) اثرات کو سپر سٹریٹ کا نام دے سکتے ہیں۔ اگرچہ یہ بالکل غیر متوقع ہے کہ آج کے ایران میں مقامی زبانیں فارسی کی جگہ لے لیں۔

عام طور پر سب سٹریٹ (Substrate) کی اصطلاح ایسے زبان کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے جو ایک علاقہ یا گروہ میں پہلے سے بولی جاتی ہو اور جس نے نئی آنے والی زبان پر واضح اثر ڈالا ہو (Trask 2000:329) جیسا کہ سپر سٹریٹ میں ہے۔ یہ اصطلاح عام طور سب سٹریٹ زبان اور نئی آنے والی زبان کی حیثیت میں فرق کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں سب سٹریٹ زبان کم حیثیت والی زبان ہے۔ اسی طرح یہ اصطلاح اس وقت بھی استعمال ہوتی ہے جب نئی زبان پرانی زبان کی جگہ لے اور پرانی زبان نئی پر اپنی بناوٹی (Structural) اور لفظی (lexical) خدوخال (Traits) چھوڑدے۔ اِس کی مثال سلٹک (Celtic) زبان کی انگریزی پر خدوخال ہیں۔

ساراوان کی مرکزی وادی کا لہجہ جسکا ذکر اُوپر کیا گیا، متصل لسانی پس منظر پر کام کے سلسلے میں خاص طور پر دلچسپ ہے۔ ساراوان میں مالداری کے علاوہ معیشت بنیادی طور پر بندوبستی زراعت (Settled Agriculture) پر منحصر

ہے جسکی ایرانی بلوچستان کے دوسرے حصوں کے مقابلہ میں ایک لمبی تاریخ ہے اور یہی تعلیم میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ کیونکہ تعلیم فارسی میں ہے اِس لئے یہ فارسی کے اثر کو کافی مضبوط کرتی ہے۔ فارسی میں تعلیم اور صدیوں پہلے فارسی بولنے والوں کی سارااوان آمد دونوں نے ملکر اس لہجہ کو متصل زبانوں پر کام کے لئے ایک دلچسپ چیز بنادیا۔

یہ دکھائی دیتی ہے کہ ماضی میں بلوچی سارااوان میں بلند حیثیت کی زبان تھی۔ اِس لئے مہاجروں نے فارسی ترک کرکے بلوچی اپنالی بہرحال سب سٹریٹ مظہر (Substrate Phenomena) کا نمایاں اثر فارسی سے سارااوانی بلوچی پر دیکھا جاسکتاہے۔ یہ خدوخال ایرانی یاپاکستانی بلوچستان میں بلوچی کے کسی اور لہجہ میں نہیں ملتے۔ ایسے مظہر کی مثال مضاف علیہ (Genitive) کی جگہ اضافہ (izafa) لگا کر اِسے مضاف علیہ سے منسوب کرنا،کلی طور یہ قسم فارسی سے بہت مشابہہ ہے۔

دوسری بناوٹی تبدیلی (Structural Reshaping) یہ ہے کہ تمام لاحقے (Post-positions) حرف جار (Prepositions) میں تبدیل ہوگئے۔

آج کی فارسی بلاشبہ بلند حیثیت والی زبان ہے۔ اُس کی سپر سٹریٹ اثرات سارااوانی اور اِسی طرح ایران میں دوسرے بلوچی لہجوں پر کافی ہیں۔ سپر سٹریٹ مظہر میں سے مارفالوجیکل (Morphological) بناوٹ کی بجائے نحوی بناوٹ (Syntactic Construction) (بلاواسطہ چیزوں کیلئے) کی مثال دی جاسکتی ہے۔ایڈجیکٹوز (Adjectives) کو اِن کے اسم (Noun) کے بعد اضافہ (Izafa) کے ساتھ ملانے کے لئے رکھنا۔اور فعل کی ٹنس اسپیکٹ مُوڈ (Tense Aspect Mood (TAM) فارم کی قسم فارسی بناوٹ بنی ہے۔ (جیسے پروگریسو حال اور ماضی) اِس کے علاوہ ہر لہجہ میں بہت زیادہ فارسی الفاظ کا استعمال بھی دیکھا جاسکتاہے۔

ایرانی ریاست میں بلوچی زبان کا مستقبل:

جب تک ایک زبان کو اِس کے بولنے والے روزمرہ زندگی کے ہر میدان (Domains) میں استعمال میں لائیں گے یا کم از کم بولنے والوں کی اکثریت اپنی زبان کا استعمال اِسی طرح کرے گی، ایسی زبان کو خطرے میں گھرا نہیں کہہ سکتے۔ لیکن جونہی سماجی اقتصادی تبدیلیاں آتی ہیں۔ اِن سے ایک کمیونٹی کی رہن سہن ' ثقافت اور کسی حد تک اس کی شناخت کی تمام بنیادیں ہِل جاتی ہیں جب یہی کچھ ایک اقلیتی گروہ جیسے بلوچ کے ساتھ پیش آئے تو گروہ یا اِس کے افراد مختلف نظریئے اپنا سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اِن میں جو نمایاں اور منفرد خصوصیات ہیں، جیسے اِن کی زبان ' اُن سے دست بردار ہونے پر تیار ہوکر اکثریتی سماج میں قبولیت کی مکمل کوشش کریں ' دوسری صورت میں وہ اپنی شناخت کے دفاع کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح کی خودمختاری کا مطالبہ کریں ' جیسے وہ ملک کے اندر رہتے ہوئے علیحدہ گروہ کی حیثیت سے اپنی شناخت بچانے کی بھی کوشش کرسکتے ہیں۔ یہ سوچ ایسی صورت میں حقیقت پر مبنی متبادل ہوگی اگر ریاستی حکمران مخصوص لسانی ' ثقافتی ترقی اور عقیدے کے مطابق عبادات کی آزادی کے مناسب مواقع دیں۔

ایرانی بلوچستان میں فارسیوں کے خلاف گہرے شکوک پائے جاتے ہیں۔ جنہیں تحقیر سے اکثر اوقات گجر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بلوچی رسم ورواج جیسے انکی سماجی تنظیم اور وقار کی قدریں (Honour Codes) فارسیوں سے کافی مختلف ہیں۔ بلوچستان پر تہران سے بالواسطہ حکمرانی کے خلاف 1928ء کے بعد کئی بغاوتیں ہوئیں۔(see e.g. Hosseinbor 2000: 141-164)

1979ء کے بعد مختلف مذہبی مسالک نے بھی زور پکڑا۔ بلوچوں میں شدت سے یہ احساس پایا جاتا ہے کہ انکے سنی مسلک کی وجہ سے اسلامی ریپبلک میں جو شیعہ مسلک پر قائم ہے، انہیں آگے بڑھنے کے لئے مناسب مواقع نہیں دیئے جاتے۔

ایرانی بلوچوں کے پاکستان' افغانستان اور خلیجی ریاستوں میں رہنے والے بلوچوں کے ساتھ بھی مضبوط رشتے ہیں' جیسے 1928ء کے واقعہ کے بعد بڑی تعداد میں بلوچوں کی کراچی ہجرت' افغانستان کے بلوچوں کے ساتھ قبائلی تعلقات' اور خلیجی ریاستوں میں روزگار کی تلاش میں مہمان مزدور کی حیثیت سے جانا۔ اکثریتی سوسائٹی میں ضم ہونے کے انتخاب کا مطلب ہے اِن رشتوں سے دست برداری۔ اِس لئے یہ غیر متوقع ہے کہ بلوچ مکمل طور اکثریتی سوسائٹی کو قبول کریں۔ اگر موجودہ سیاسی فریم ورک میں ثقافتی و لسانی ترقی کے لئے مناسب اقدامات نہ کیئے گئے' پھر یقینی طور سیاسی خود مختاری کیلیئے مزید مطالبات سامنے آنے کی توقع ہے۔

یقیناً بہت سے بلوچ دانشور ایران میں بلوچی زبان کی مستقبل کے بارے جائز طور فکر مند ہیں۔ بلوچستان میں تعلیم کی ابتداء اور جدید سماجی اقتصادی ڈھانچہ کے مروج ہونے سے روائتی سماج کی بنیادیں آہستگی سے اور یقینی طور اُکھڑتی جارہی ہیں۔ بہرحال اِس حقیقت سے بھی آگاہی ہو رہی ہے کہ اگر بلوچی کو ایرانی بلوچستان میں مضبوط زبان رہنا ہے تو خود بلوچ پر لازم ہے کہ اپنی زبان کے بارے مثبت رویہ اپنائے اور نئے میدانوں میں اِسکی ترقی کے لئے کام کرے' مثلاً لکھائی اور آخر کار بلوچی میں تعلیم کو ممکن بنانا۔ کچھ اقدامات پہلے سے اُٹھائے گئے جیسے دو زبانی (بلوچی فارسی) رسالوں کی اشاعت اور زیادہ سے زیادہ ادبی ثقافتی مجالس کے انعقاد کے لئے انتظامات وغیرہ۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ ایرانی بلوچستان میں یونیورسٹی

سطح پر بلوچی مضمون کے لئے کوششیں ہو رہی ہیں یہ وہ اقدامات ہیں جو پاکستانی بلوچستان میں کئی سال پہلے اُٹھائے گئے۔

یہ ریاست ہی ہے جو لسانی اور ثقافتی پالیسیاں مرتب کرتی ہے' انتظامی اور تعلیمی نظام کو کنٹرول کرتی ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ لوگوں کے مطالبات اپنے حکمران اشرافیہ کے فیصلوں پر کافی اثرانداز ہوتے ہیں۔ موجودہ مضمون میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بیسویں صدی کی ابتداء سے ایران کی نسبت برطانوی ہند میں بلوچی زبان کے لئے زیادہ موافق حالات نے ایک نئی تعلیم یافتہ بلوچ نسل کے لئے اپنی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کے لئے راستہ ہموار کیا یہ بتانا بہرصورت ضروری ہے کہ پاکستان میں بھی' بلوچی ثقافتی تحریک کو گھمبیر مسائل درپیش ہیں' جن میں پڑھنے والوں کی کم تعداد' معاشی مشکلات' اور سرکاری شکوک وشبہات شامل ہیں۔ اِس کے علاوہ پاکستانی بلوچستان میں پرائمری تک بلوچی زبان میں تعلیم کی ناکام شروعات کی شدید منفی اثرات کو بھی دیکھاجاسکتاہے۔

دوسری طرف جیسا کہ اُوپر بیان ہوا' سیاسی طاقت ایک تبدیل ہونے والی چیز ہے۔ ایک وقت بلوچ قبائل ایرانی ساراوان میں بڑی طاقت تھے۔ انہوں نے دوسری نسلی گروہوں جیسے اُفغان اور سیستانیوں کو جذب کیا۔ جبکہ آج شیعہ مسلم ایران میں حکمران ہیں، پیشگوئی کرنا مشکل ہے کہ مستقبل میں ایران اور پاکستان کا سیاسی منظرنامہ کیاہوگا۔ کیاموجودہ حکمران اشرافیہ اور بلوچ کے مابین سیاسی طاقت میں نئی تبدیلی آسکتی ہے؟ اِس بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، صرف قیاس آرائی ہی ہوسکتی ہے۔

مادری زبان میں تعلیم، بلوچی زبان کی سلامتی اور بقا

(فارل ٹیمو تھی)

(یہ مضمون جناب فارل ٹیمو تھی نے اپسالا یونیورسٹی (سویڈن) میں بلوچی پر ایک سمپوزیم (جو محترمہ کارینا جاہانی نے منعقد کرائی) ۷ اگست ۱۹۹۷ء میں پڑھی تھی۔)

تعارف: اس تحریر کا مقصد بلوچی زبان میں تعلیم سے منسلک حل طلب مسائل اور ان مشکلات و فوائد کا جائزہ لینا ہے جو شاید ابھر کر سامنے آئیں۔ بلوچی زبان کا کچھ دیگر زبانوں پر تحقیق (Studies) سے بھی موازنہ کر کے دیکھیں گے ،وہ اکثر بلوچی سے چھوٹی ہیں اور بڑے خطرات سے دوچار ہیں ان تحقیق سے جو بھی اصول سامنے آئے بہت سے بلوچی زبان پر پورے اترے ہیں۔ بہتر اور موزوں وقت یہی ہے کہ بلوچی زبان کے مستقبل کے سوال کو اٹھایا جائے نہ کہ اتنا انتظار کریں کہ بلوچی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہو اس لئے اس مضمون کے موضوع کو پھیلا کر اور میدان کو وسیع کر کے بلوچی زبان کے تحفظ اور بہتری کے لئے بات کر رہے ہیں۔

آج دنیا میں اندازاً چھ ہزار پانچ سو (۶۵۰۰) زبانوں میں سے خیال ہے کہ آنے والے پچاس سالوں میں ان کی اکثریت ختم ہی ہو گی۔ دنیا کی تاریخ میں زبانیں آئیں اور گئیں لیکن آج کے دور میں ایسے اسباب موجود ہیں جو پہلے کبھی نہیں تھے جنہوں نے دنیا میں بہت سی زبانوں کو ایسے خطرات سے دوچار کیا کہ وہ پہلے کبھی نہیں تھے۔ پہلی سبب یہ ہے کہ دنیا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور نقل و حرکت کی وجہ سے بہت کم لوگ ایسے ہونگے جن کا دوسرے زبان بولنے والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ ہو اس طرح ایک بڑی آبادی مسلسل غیر زبان بولنے والوں سے ملتا جلتا ہے۔

دوسری سبب الیکٹرانک میڈیا کی ترقی، استعمال اور مواصلات کی بہت تیزی ہے ابھی ایسے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچی جسے زیادہ ترنیم خانہ بدوش مالدار، دیہاتی کسان اور ماہیگیر بولتے ہیں جو دور دراز وسیع بلوچستان میں رہتے ہیں، شہری تجارتی اور تفریحی ترقی سے متاثر نہیں ہو گی۔ لیکن دلچسپ بات ہے کہ لیاری کے بلوچوں میں خاندانی تفریح صرف ایک نسل میں قصہ کہانیاں سننے کی بجائے پہلے ریڈیو پھر ٹی وی، ویڈیو اور اس کے بعد سیٹلائیٹ نے لے لی۔ یہ ایک ایسی کمیونٹی کے ساتھ پیش آیا جس کے پاس زیادہ اقتصادی وسائل نہیں تھے۔ بلوچستان کے آبادی والے علاقوں جیسے گودار، پنجگور، تربت، وغیرہ میں ترقی اور بجلی پہنچنے سے ظاہر ہوتا ہے یہ عمل تمام بلوچی بولنے والے علاقوں میں تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

آنے والے وقت کی پیش گوئی مشکل ہے۔ ایک منظر (Scenario) یہ ہو سکتا ہے کہ ذرائع ابلاغ (Mass Media) کی ہر طرف پھیلنے اور ملک میں قومی زبان (اردو) میں تعلیم بلوچی کو ایسے نیچے گرادیگی کہ بلوچی صرف دیہاتوں کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں بولی جائیگی شہروں اور گاؤں میں صرف گھر کے بوڑھے لوگ بلوچی میں بات کریں گے۔

زبان کے حلقے:

یہ جاننے کا طریقہ کہ زبان کتنی جاندار اور طاقتور ہے یہ ہے کہ سوسائٹی میں یہ زبان کہاں کہاں استعمال ہوتی ہیں اگر ایک زبان گھر، کام کاج، تعلیم، تجارت ایڈمنسٹریشن، مذہب، تفریحی جگہوں اور صحافت میں استعمال ہوتی ہے پھر اس زبان کی ضرورت سوسائٹی کے کافی حلقوں میں ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ ایک زبان کی طرح وہ اپنی ترقی کو قائم رکھے گی دوسری طرف اگر ہم دیکھیں کہ گھر میں صرف بوڑھی عورتیں ایک زبان میں بات کرتی ہیں اور تمام دوسرے مقاصد کے لئے دوسری زبان استعمال ہوتی ہو۔ تو پھر ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ زبان کمزور ہے اور ہو سکتا ہے چند پشتوں بعد ختم ہو جائے۔

بلوچی زبان جو اتنے وسیع سرزمین پر بولی جاتی ہے اس کے استعمال کے مختلف پیمانے (Leveles) ہیں۔ اندرون بلوچستان بلوچی کم و بیش ہر میدان میں استعمال ہوتی ہے۔ لیکن شہروں میں دوسری زبانیں (Second Langage) جیسے فارسی اُردو بہت سے کاموں، تعلیم اور میڈیا میں استعمال ہوتی ہیں وہاں بلوچی زیادہ تر گھروں اور مقامی کمیونٹی کی زبان کی طرح زندہ ہے اس وقت کسی حد تک بلوچی زبان کو طاقت عطا کرنے کی وجہ تعلیم کا نہ ہونا ہے کیونکہ اکثر بلوچ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے تجارتی دفتری اور ادبی کاموں میں بہت کم حصہ لیتے ہیں اس طرح جہاں دوسری زبانیں استعمال ہوتی ہیں وہاں بلوچوں کا حلقہ بہت محدود ہے۔ یہ عورتوں کے لئے زیادہ صحیح ہے، اگرچہ تفریح کے لئے الیکٹرانک میڈیا کا استعمال ان کے اکیلے پن کو کم کر رہی ہے لیکن بلوچوں کی علیحدگی و ناخواندگی نہ تو بلوچوں کے فائدے میں ہے اور نہ لمبی مدت تک بلوچی کی بقا کے حق میں ہے۔ ناخوندا گی مدام نہیں ہو سکتی۔ چند پشتوں بعد جب لوگوں کا بڑے تجارتی اور قومی زبانوں سے رابطہ ہو گا۔ تو خاندان دو زبانی (Bilingualism) کی طرف مائل ہونگے اور پھر یہ

زیادہ بڑھتا جائیگا آخر کار صرف منڈی اور قومی زبان استعمال ہو گی یہ عمل (Process) کراچی میں پہلے سے شروع ہوچکی ہے اور جیسا کہ میں سمجھتا ہوں ایران میں بھی اسی طرح ہے۔ بہت سے کمیونٹیز میں مذہب کے میدان میں بلوچی میں وعظ نصیحت ہوتی ہے لیکن عبادت اور نماز کے متبرک آیات عربی میں ہیں نمازی اور ذگری دونوں مسلمانوں میں یہی ہوتا ہے اس طرح بلوچی وہ پشت پناہی سے محروم ہے جو بہت سے زبانوں کو مذہب کے متبرک آیات کی وجہ سے حاصل ہے اس کے باوجود یہ بہت مثبت عمل ہے کہ دین کے تمام موضوع (Topic) پر بلوچی میں پوری طرح بحث ہوتی ہیں یہ اچھی بات ہے کہ بلوچی نے عربی فارسی اور اردو اصطلاحات (Terminologies) کے آزاد استعمال سے یہ سب کچھ حاصل کی ادبی میدان میں یہ مولانا خیر محمد ندوی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ان کی وجہ سے ایک مستحکم (Well Established) سابقہ مثال اور فورم موجود ہے جہاں مذہبی مسائل پر بلوچی میں بحث مباحثہ ہوتا ہے۔

کاترین وولارڈ (Kathryn Woolard) (۱۹۸۹ء) نے اقلیتی زبانوں کے مطالعہ سے مشاہدہ کیا کہ دو زبانی (Bilangual) مقرر نے جب موضوع / میدان میں بات کرنے کے لئے زبان چنی، پھر وہاں چھوٹی زبان جو کمزوری اور زیردستی کی نشاندہی کرتا ہے۔ لیکن جب کسی خاص موقع پر وہاں حصہ لینے والوں کی مطابقط سے ایک زبان چنی جائے پھر چھوٹی زبان دوسری زبان میں تبدیل ہونے کی کمزوری نہیں دکھاتی۔

اس طرح مثلاً اگر ایک بلوچ دوسرے بلوچ کو اردو میں خط لکھنا اپنی مجبوری محسوس کرے تو یہ بلوچی کی کمزوری اور محدود ہونے کو ظاہر کرتا ہے لیکن اگر ایک بلوچ ایک غیر بلوچ کو اردو میں اور بلوچ کو بلوچی میں خط لکھے تو اس طرح کی دوزبانی کا استعمال بلوچی کی کمزوری کو ظاہر نہیں کرتا۔ رابطہ اور دوسری زبان کا استعمال بذات خود چھوٹی زبان کے لئے خطرہ نہیں۔

جب تجارت، ٹیلی ویژن، اخبارات، تعلیم کی وجہ سے بلوچ زیادہ سے زیادہ ایسے میدانوں میں کام کریں گے جہاں بلوچی نہیں بلکہ دوسری زبانیں ہونگی۔ تو یہ بلوچ کمیونٹی کے لئے ایک چیلنج ہو گا۔ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ظاہر ہے بلوچی کا استعمال ان میدانوں میں جتنا ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ کیا جائے اور واحد طاقتور آلہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مادری زبان میں تعلیم ہے۔ کیونکہ مادری زبان میں تعلیم بلوچی زبان کے استعمال کو مختلف اکیڈمک (Acadmic) میدانوں میں پھیلانے کا ایک وسیلہ ہو گا، اگر مادری زبان میں تعلیم سکول کے تمام نصاب تک وسیع نہ بھی ہو سکے پھر بھی تعلیم کا اثر اور رسمی کاموں میں مادری زبان کا استعمال اس کی استعمال کے میدان کو بڑی حد تک وسیع کرے گا۔

مادری زبان میں تعلیم کو روایتی طور پر بڑی امید کے ساتھ دیکھا گیا کہ زبان کو بدلنے سے روکتی ہے۔ اگرچہ جوشوا فشمین (Joshva Fishman) نے تنبیع کیا کہ اکیلے مادری زبان میں تعلیم زبان کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکتی جب تک گھروں میں اس کا استعمال مثبت انداز میں دوبارہ بحال نہ کیا گیا ہو۔ اس طرح مثلاً گیلک (Gaelic) زبان آئرلینڈ میں سکولوں میں پڑھایا اور بہت سے حکومتی کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی گھروں اور کمیونٹی میں وسیع پیمانے پر استعمال نہیں ہوتا۔ اس طرح فشمین نشاندہی کرتا ہے کہ صرف مادری زبان میں تعلیم زبان کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے کافی نہیں۔ لیکن بلوچی گھر اور کمیونٹی میں بڑی حد تک بولی جاتی ہے بلوچی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا استعمال گھروں سے باہر زیادہ ہو اور خاص کر عام حالات میں اس کا استعمال زیادہ ہو۔ پس یہ امید کی جاتی ہے کہ مادری زبان میں پڑھانے اور تعلیم عام ہونے سے بلوچ خطوط، پوسٹ سائنز (Post Signs) نوٹسز (Notices) اور بلیٹنز Bulletins بلوچی میں لکھیں گے اور بلوچی اخبار اور میگزین پڑھیں گے۔ اس طرح تجارتی اور حکومتی انتظام Government Administration بھی بلوچی میں کرنے لگیں گے۔

مادری زبان میں تعلیم:

کئی سالوں سے یہ تسلیم شدہ ہے کہ مادری زبان تعلیم کے لئے سب سے اچھی زبان ہے خاص طور ابتدائی سالوں میں یونیسکو (UNESCO) کا مونوگراف تعلیم میں مقامی (قومی) زبانوں کا استعمال ۱۹۵۳ء کہتا ہے۔ تعلیمی میدان میں ہم تجویز کرتے ہیں مادری زبان میں تعلیم جس لیول تک ممکن ہو دی جائے اور خاص طور پر بچے پڑھائی کا آغاز سکولوں میں مادری زبان سے کریں۔ چھوٹے بچوں کے لئے پہلی دفعہ سکول جانا بہت مشکل تجربہ ہو سکتا ہے گھر کے آزاد ماحول سے دور یکدم سکول کے مخصوص اور ڈسپلن ماحول میں جانا اور ان سے منظم طریقے سے کام کرنے کی توقع رکھنا، پڑھ لکھ سیکھ جانا ریاضی اور دوسرے مضامین کی ٹرمینالوجیز Terminologies اور مثالوں وغیرہ کے تصور کو سمجھنا بذات خود بددل کرنے والی مہم (Task) ہے۔ اگر یہ تمام بیگانے زبان میں ہوں تو یہ بچے کے لئے پریشان کن (Confusing) ہو گا اور یہ حقیقت بھی شامل ہو کہ سکول کا کام ضرورت کے مطابق نہ کر پانے پر بچوں کی اکثر پٹائی بھی ہوتی ہو پھر یہ ایسا تجربہ ہو گا کہ بچے دل برداشتہ ہو کر سکول چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

پس یونیسکو کے رپورٹ کے مطابق ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ صدمہ جو چھوٹے بچوں کو گھر سے باہر آنے اور سکول جانے سے پہنچتا ہے اتنا شدید ہوتا ہے کہ اسے کم کرنے کے لئے جو بھی ممکن ہو قدم اٹھانا چاہیئے خاص طور پر وہاں جہاں ابھی تک چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لئے جدید طریقے سکول میں رائج نہیں ہو سکے اس کا اثر کراچی میں لیاری کے بڑی بلوچ کمیونٹی پر یہ ہوا کہ پہلے سالوں میں سکول چھوڑنے کی تعداد (Drop Out Rate) ۵۰ فیصد ہے (یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام بچے سکول میں داخلہ نہیں لیتے) اور کئی بچے آنے والے سالوں میں سکول چھوڑ جاتے ہیں۔

لیاری کے سکولوں میں سیٹوں کی کمی کی وجہ سے نئے آنے والے بچوں سے اردو اور ریاضی کا داخلہ ٹیسٹ لیا جاتا ہے۔ عملی طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری سکولوں میں داخلہ لینے سے پہلے اکثر بچوں کو ایک یا دو سال پرائیویٹ سکولوں یا ٹیوشن سنٹرز میں پڑھنا پڑتا ہے۔ اس طرح وہ سکول میں دوسرے بچوں کے مقابلہ میں ایک یا دو سال بعد داخلہ لیتے ہیں۔ جو ان کی بددلی کا سبب بنتا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے دوسری چیز جو متاثر ہوتی ہے وہ معیار تعلیم ہے مجھے یاد ہے گوادر کے نزدیک ایک دیہات میں سکول کے ایک بچے نے اردو کتاب سے مضمون صحیح اور روانی سے پڑھی لیکن جب اس سے پوچھا گیا کہ جو کچھ تم نے پڑھا اس کے معنی کیا ہیں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ مشکل طالب علموں کے ساتھ کئی سال تک رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آٹھویں جماعت سے پہلے محنتی اور ہوشیار بچے بھی حقیقی معنوں میں اپنے سبق کا مطلب نہیں سمجھ پاتے۔ جہاں بلوچ بچوں کا مقابلہ اعلیٰ تعلیم اور روزگار کے میدان میں ان بچوں سے ہو جن کی مادری زبان تعلیمی اور تجارتی ہے ظاہر ہے وہ ہمیشہ پیچھے رہیں گے اور انہیں یہ نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے گذشتہ چند سالوں سے کراچی میں نسلی فسادات اور تشدد کی وجہ سے تعلیمی اداروں میں داخلہ اور روزگار کوٹہ سسٹم کی بجائے میرٹ کی بنیاد پر دی جارہی ہے۔ بذات خود میرٹ ایک اچھی چیز ہے لیکن بلوچ اور دوسری نسلی اقلیتوں کے بچے جن کی مادری زبان تعلیمی نہیں ہے، ان کا ان بچوں سے مقابلہ کرانا جنہوں نے مکمل تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کی، حقیقت میں میرٹ کے اصول کی بنیاد پر نہیں بلکہ نسلی و لسانی بنیاد پر ہے۔ مادری زبان میں تعلیم کا نہ ہونا ایک وجہ ہے کہ بہت سے لوگ تعلیم کو محض رٹا لگا کر امتحان پاس کرنا اور بہتر روزگار کا ذریعہ سمجھتے ہیں، یہ سوچ معدوم ہے کہ بچے وہ مضامین جو انہوں نے پڑھے، سمجھیں اور ان پر سوچیں۔ یہ سوچ بھی نہیں کہ علم زندگی کا ایک بہترین ہنر ہے جو تعلیم ختم ہونے کے بعد بھی

اس کی بہتری کے لئے تمام عمر اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ایک دلچسپ پہلو بلوچی اکیڈمیز اور ادبی رسائل کی ترقی کا یہ ہے کہ بہت سے بلوچ بلوچی میں دلچسپی اپنے آپ لیتے ہیں وہ بلوچی سیکھتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں اس کے باوجود کہ بلوچی عام تعلیمی پروگرام کا حصہ نہیں۔

بلوچی میں تعلیم کی ترقی اور بچوں کو پڑھانے کے لئے بہت سی غیر سرکاری کتب لکھی گئیں۔ بنیادی اور اے بی سی کی کتب میں سے مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:

(۱)۔ ۱۹۵۱ء میں مکتبہ سوغات نے مولوی خیر محمد ندوی کی بلوچی قاعدہ شائع کی جو ۱۹۷۷ء، ۱۹۷۹، ۱۹۸۵ء، میں دوبارہ شائع ہوئی۔ مکتبہ سوغات نے خیر محمد ندوی کی "بلوچی اولی کتاب" بھی ۱۹۸۷ء، ۱۹۸۵ء میں شائع کی جو ایک بنیادی اور پڑھنے والی کتاب لمبے حروف کے ساتھ ہے۔

(۲)۔ ۱۹۶۰ میں سید ہاشمی نے بڑے عمر کے پڑھنے والوں کے لئے "بلوچی بنگیجی" کتاب شائع کی۔

(۳)۔ ۱۹۶۳ء میں بلوچی اکیڈمی کراچی نے اکبر بارکزئی کی "زہگ بلد" شائع کی اس کا پہلا حصہ ۱۹۸۷ء میں بلوچ اتحاد کویت نے دوبارہ شائع کی یہ بچوں کی بنیادی کتاب ہے جو حروف اَبجد اور لمبے حروف کے ملانے سے پہلے دو پھر تین اس طرح کے پڑھنے کے طریقہ کو استعمال میں لاتا ہے۔

(۴)۔ مارچ ۱۹۷۲ء میں قیوم بلوچ نے بلوچی "زہگ بلد" شائع کی جو فوٹو اور نشانات کی بنیادی الف، ب کی کتاب ہے۔

(۵)۔ مارچ ۱۹۷۲ء میں بلوچی پبلیکیشنز نے لعل بخش رند کی "بلوچی بوان بلوچی ہیل بکن" جو تبدیل شدہ رومن سکرپٹ میں الف، ب کی کتاب ہے شائع کی۔

(۶)۔۱۹۸۶ء میں شرپ کتابجاہ نے غلام محی الدین معیار کی الف ،ب کی کتاب ''سکین'' شائع کی۔

(۷)۔۱۹۸۷ء میں کوئٹہ میں شال ایسوسی ایشن پاکستان نے عبد الحکیم صادق اور تیمور خان کی بنی کتاب شائع کی یہ لعل بخش رند کی ''بلوچی بوان'' کی طرح ہے لیکن عربی سکرپیٹ اور رخشانی لہجہ میں الف ،ب کی کتاب ہے۔

(۸)۔اپریل ۱۹۹۵ء میں کراچی سے آزاد جمالدینی اکیڈمی نے لال محمد کی ''گل رنگ'' اور یاسمین کی بنیادی کتاب ''پیتاپ'' اور ان کی الف ب کی کتاب بنی کتاب دسمبر ۱۹۹۵ء میں شائع کی۔

اس کے علاوہ بہت سے اکیڈمیز نے بچوں کی کتابیں اور نئے پڑھنے والوں کے لئے آسانی سے پڑھی جانے والی مواد شائع کیں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ نے بہت سی کتب بچوں کے لئے شائع کیں دوسروں کے علاوہ کلاکوٹ کوچنگ سنٹر آزاد جمالدینی اکیڈمی اور بلوچی لبزانکی دیوان بھی اس میدان میں سرگرم رہے۔

ان میں سے جیسا کہ مجھے معلوم ہے لال بخش رند کی کتب کچھ عرصہ تک رسمی تعلیمی پروگرام میں استعمال ہوئی تھیں۔اب آزاد جمالدینی اکیڈمی کی کتب ایک تعلیمی پروگرام میں استعمال ہو رہی ہیں۔اس کے علاوہ شال ایسوسی ایشن کی بنی کتاب بلوچستان کے کچھ سکولوں اور سویڈن میں استعمال ہوئی تھی۔

موجودہ وقت میں بلوچوں کے لئے ریاستی تعلیم ایران میں فارسی پاکستانی بلوچستان اور مرکزی کراچی میں اردو سندھ میں زیادہ تر سندھی اور خلیج میں عربی ہے ان زبانوں کے الفاظ اور ان کے علاقائی خدوخال مستعار لینے سے ایک علاقہ کی بلوچی دوسرے علاقہ کی بلوچی سے مختلف ہوتی جارہی ہے اس طرح بلوچی زبان کمزور ہو رہی ہے۔ان زبانوں کے علاوہ جو تعلیم اور دفتری میدانوں میں استعمال ہوتی

ہیں۔ براہوئی پشتو، و سرائیکی بھی شامل کئے جاسکتے ہیں اگر چہ یہ تعلیمی زبان نہیں لیکن بلوچی پر ان کے علاقائی اثرات ہیں۔

۱۹۸۸ء میں پاکستانی بلوچستان میں مادری زبان میں تعلیم کا ایک حکومتی پروگرام تیار کیا گیا۔ تعلیم براہوئی بلوچی پشتو اور اس کے ساتھ ساتھ اردو میں دی جانی تھی۔ ان زبانوں میں تعلیم پہلی کلاس سے شروع ہونی تھی اور سال بہ سال آگے بڑھتی اور اسی طرح سکول کے تمام کلاسوں میں یہ زبانیں پرھائی جاتیں۔ بلوچی کے لئے کمیٹی بنائی گئی تاکہ وہ نصابی کتب کے لئے مضامین، سٹائل، اور لہجہ کا فیصلہ کرے۔ کیونکہ سمجھا جارہا تھا کہ بہتر یہی ہے تمام بلوچ علاقوں میں ایک کورس اور ایک جیسی نصابی کتب ہوں۔ ایک کوشش کی گئی کہ مشرقی و مغربی بلوچی لہجے کے الفاظ اور رسم الخط (املا) ملائے جائیں۔ اس کے لئے پانچ نئے مشترکہ کرکٹر (نشان) دونوں لہجوں کے تلفظ کو ملانے کے لئے ایجاد کئے گئے اس بارے تفصیل سے سٹینڈرڈائزیشن (Standardisation) میں بحث کریں گے۔

پاکستانی بلوچستان میں بلوچی میں تعلیمی پروگرام کی ناکامی کی ایک ممکنہ وجہ سیاسی ہے مخفی اور پیچیدہ سیاسی مسائل پر بات کرنے پر ملوث نہ ہونے کی خواہش رکھتے ہوئے بلوچستان میں حالات اس طرح تھے اور ہیں کہ افغان مہاجرین کی بڑے ریلی سے صوبہ میں بنیادی اعداد و شمار (Demography) تبدیل ہونے کا خوف ہے۔ ان مہاجرین میں سے کافی پاکستان میں بس گئے ان کو پاکستانی شناختی کاغذات حاصل کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ان کی اکثریت نسلا پشتون ہے اور صوبے میں پہلے سے کافی تعداد میں پشتونوں کے ساتھ ان کا گھل مل جان آسان ہے۔ مشترکہ بلوچ اور براہوئی آبادی پشتونوں سے زیادہ ہے۔ بلوچ اور براہوئی نسلاً ایک لیکن لسانی طور پر مختلف ہیں اس لئے جب بلوچستان کے سکولوں میں اردو

پڑھائی جائے تو ان کی نسلی اتحاد پر کوئی اعتراض نہیں ہو تا۔ لیکن اگر جدا بلوچی اور براہوئی سکول کھولے جائیں پھر زبان کی بنیاد پر تقسیم زیادہ دکھائی دے گی۔ اگر بلوچ اور براہوئی کو ایک کی بجائے دو مانا جائے تب یہ ڈر تھا پشتون یہ مطالبہ نہ کریں کہ وہ صوبہ میں تمام دوسری قوموں سے زیادہ ہیں۔ سیاسی میدان میں چونکہ اعداد شمار سب سے طاقتور قوتوں میں سے ایک ہے۔ اس لئے کچھ نے یہ محسوس کیا بہتر یہی ہے کہ اردو میں تعلیم جاری رکھی جائے تاکہ بلوچوں میں زبان کا فرق سامنے نہ آنے پائے۔

زبان سے محبت:

شاید زبان کی سلامتی اور اسے زندہ رکھنے کے لئے سب سے اہم واحد قوت زبان بولنے والوں کا اپنی زبان سے محبت ہے۔ بلوچ لوگ اپنی زبان سے مثبت سوچ کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن کلی طور پر یہ ایک بے عمل اظہار نظر آتا ہے اکثر بلوچی بولنے والوں کو نہ تو بلوچی سے حقیقی دلچسپی ہے اور نہ اسکی ترقی کی تحریکوں میں شامل ہوتے ہیں۔

کراچی کے کچھ بلوچ بھی گھر میں اور دوستوں کے ساتھ اردو کے زیادہ سے زیادہ استعمال کو سماجی اور اقتصادی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اس طرح وہ بلوچی کے استعمال کو مخصوص حالات میں ہی مناسب سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک بلوچی ان پڑھ ہونے کی نشانی ہے کراچی کے بلوچ کمیونٹی میں سب سے اچھی خصوصیات میں سے ایک ٹیوشن سنٹرز اور فٹبال کلبوں کا کردار ہے۔ جہاں کالج کے سٹوڈنٹ اور گریجویٹ کمیونٹی کے بچوں کو اضافی تعلیم مفت یا معمولی اجرت پر پڑھاتے ہیں چونکہ سکولوں کی زبان اردو ہے اس لئے ٹیوشن بھی اردو میں پڑھائی جاتی ہے۔ ان کا مقصد بچوں کی تعلیمی قابلیت بڑھانا ہے۔ انہیں زبان کے

مسائل سے کوئی سروکار نہیں بلوچی میں بچوں کو کچھ سمجھایا جاتا ہے، لیکن کورس کا مواد اردو میں ہے۔ کچھ ٹیوشن سنٹر بلوچی میں تعلیم کے خلاف ہیں۔ اس کے وجوہ سماجی اور اقتصادی بھی ہیں جیسا کہ اوپر بیان کی گئی ہیں اور سیاسی بھی، وہ ادبی اور تعلیمی میدان میں بلوچی کے استعمال اور ترقی کو بلوچ قوم پرست تحریک سے منسلک دیکھتے ہیں۔ کراچی بلوچوں کی اکثریت تاریخی طور پاکستان پیپلز پارٹی کی مضبوط حامی رہی ہے لیکن ۱۹۷۳ء میں یہ پی پی پی کی حکومت تھی جس نے بلوچستان میں بلوچ حکومت ختم کی اور اس کے نتیجہ میں بلوچ مزاحمت کو طاقت سے دبایا۔ اس طرح تاریخی طور پر بلوچستان اور کراچی کے بلوچوں میں کسی حد تک سیاسی اختلاف موجود ہے۔ بلوچی زبان کے مستقبل کے لئے جیسا کہ دکھائی دیتا ہے بہت ضروری ہے کہ ان علاقوں کے بلوچ کم از کم سماجی اور لسانی مسائل پر اتحاد کریں۔

سماجی میدان میں بلوچی زبان کو نہ صرف موجود حالت سے زیادہ استعمال کے میدان میں ترقی دینی چاہیے (جس میں دفتری، تعلیمی اور سائنسی میدان شامل ہیں) بلکہ ان میدانوں میں بلوچی کا استعمال اس کے بولنے والوں کے لئے سماجی اور معاشی طور پر بھی زیادہ فائدہ مند ہے۔ موجودہ حالات میں بلوچی کو تعلیمی، تجارتی اور انتظامی میدان میں غیر اہم کر دیا گیا ہے اور یہاں تک کہ بلوچی کو ایک رکاوٹ سمجھا جا رہا ہے۔ دوسری طرف اردو کو ان تمام میدانوں میں لازمی اور فائدہ مند بنا دیا گیا۔

ویلز (Wales) میں جہاں ولش (Welsh) زبان (جو بلوچی سے استعمال اور قدر (Status) کے لحاظ سے کمزور تر ہے) نے سلامتی اور حیثیت کے لحاظ سے اس وقت سے کافی ترقی کی جب سے بہت سے دفتری اور تعلیمی میدانوں میں اس

کے استعمال کولازمی قرار دیا گیا۔ اس سے ویلز میں زبان کے ساتھ محبت اور توجہ پر کافی اثر پڑا اب وہاں ولش زبان کی حیثیت کو سماجی اور اقتصادی فوائد کے لئے مانا جا رہا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ اگر بلوچی کا ان میدانوں میں استعمال لازمی قرار دیا جائے تو اردو، فارسی، سندھی، عربی، اور انگریزی سیکھنا ضروری نہیں رہے گا۔ ان تمام زبانوں کا بلوچی بولنے والوں کو اب بھی ضرورت ہے۔ لیکن ان کے ساتھ بلوچی کا عام استعمال ان میدانوں میں ایک مستحکم دوزبانی(Bilangualism)ماحول پید اکر سکتا ہے۔

معیاری زبان:

بلوچی زبان کی معیاری (Standardised) رسم الخط اور لسانی مسائل پر ڈاکٹر کارینا جاہانی نے اپنی کتاب:

"Standarisation and Ortherograaphy in Balochi Language"

میں تفصیل سے بحث کی ہے۔اس لئے میں یہاں چند سماجی لسانی پہلوؤں پر بحث کرونگا جن کا تعلق مادری زبان میں تعلیم سے ہے مادری زبان میں تعلیم اور معیار (Standard) ایک دوسرے سے قریبی منسلک دکھائی دیتے ہیں۔یہ مشکل یا ناممکن ہوگا کہ بغیر کسی معیار کے بلوچی میں تعلیم دی جائے۔ایک دفعہ مادری زبان میں تعلیم کی بنیاد رکھ دی جائے چاہے وہ زبان کی جو بھی قسم ہو جلد مشہور ہو کر پھیل جاتی ہے اس وقت بلوچی کو معیاری بنانے کا بغیر تعلیم کے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ادبی اکیڈمیز ایک دوسرے کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں۔اگر کہیں کسی حد تک اتفاق ہے بھی تو اس کی آواز تمام بلوچی بولنے والوں تک نہیں پہنچ پاتی۔تازہ اشاعت کے کاری بہت کم ہیں ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے زبان کو معیاری بنانے میں اس پر کوئی زیادہ اثر نہیں ڈالا۔دوسری طرف حکومت بلوچستان کی پہلی جماعت کے لئے کتابوں کی اشاعت ایک لاکھ پچاس ہزار (۱۵۰۰۰۰) تھی۔اگر اسی طرح کا پروگرام پائیدار بنیادوں پر رکھ دیا جائے تب معیار اور تعلیم میں زبان کا استعمال دونوں کافی مضبوط ہو سکتے ہیں۔اینار ہوگن (Einar Haugan) ایک لہجہ (Vernacular) کو معیاری زبان تک ترقی دینے کیلئے چار پہلو Aspect بتاتا ہے۔

(۱) قسم کا انتخاب (Slection of form) ایک لہجہ کا انتخاب جو معیار کی بنیاد بنے۔

(۲) لہجہ کی صحیح ترتیب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ صحیح زبان کونسی ہے اور کونسی نہیں ہے۔
(۳) زبان کا دائرہ اثر (Elaboration of function) زبان کو اس حد تک ترقی دینا کہ وہ تمام لازمی استعمال کے میدانوں کی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔
(۴) کمیونٹی کا قبول کرنا (Acceptance of the Community) اگر ایک لہجہ کو اس میں بات کرنے والوں کی بڑی اکثریت استعمال میں نہ لائے تو ظاہر ہے وہ ایک تصوراتی معیار (Standard) ہو گا۔

میں یہاں ہر ایک پہلو پر بلوچی زبان کے حوالہ سے اور خاص کر مادری زبان میں تعلیم کے متعلق مختصر بات کرونگا۔

(۱) قسم کا انتخاب (Selection of Norm):۔ ایک لہجہ جو ایک زبان کی معیار کے طور چنا جائے پہلے سے بھی موجود ہو سکتا ہے۔ یا مختلف لہجوں کے ملانے سے بھی بن سکتا ہے۔ پہلے سے موجود کی اچھائی یہ ہے کہ اس میں بہت سے لوگ حقیقت میں بات کرتے ہیں اس کی کمزوری یہ ہے کہ دوسرے لہجوں میں بات کرنے والے اسے نہ مانیں اور نئے بننے والے لہجے کی اچھائی یہ ہے کہ ہر لہجے میں بات کرنے والے اسے مان جائیں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی اسے نہ مانے کیونکہ اس لہجہ میں، موجود لوگوں میں سے کوئی بھی بات نہیں کرتا۔ مادری زبان میں تعلیم کے پروگرام کے لئے جو پاکستان میں شروع کی گئی ایک کوشش کی گئی کہ مشرقی اور مغربی بلوچی کو ملا کر نیا لہجہ بنایا جائے۔ بنیادی کتابوں میں مشرقی لہجہ کے کافی الفاظ بہت سے مغربی لہجہ میں بات کرنے والوں کے لئے ایک مسئلہ تھے۔ وہ کتاب جو ۱۹۹۱ء میں پہلی جماعت کے لئے چھپی، اُس میں ۱۹۹۰ء کے سال کے کتاب کے مقابلے میں مشرقی لہجہ کے الفاظ بہت کم تھے، کچھ نے یہ خیال کیا کہ مستقبل میں صرف مغربی لہجہ معیار (Standerd) کے لئے استعمال ہو گا (میں یہاں مغربی لہجہ

میں دونوں مغربی (رخشانی) اور جنوبی (مکرانی) لہجوں کی گروپ بندی کر رہا ہوں۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے سے کسی حد تک نزدیک ہیں اگرچہ جنوبی اور مغربی بلوچی کے درمیان بھی کافی الفاظ مختلف ہیں۔اسی طرح فقروں کی ارگیٹو (Ergative) ترتیب اور پری پوزیشن (Preposition) بھی مختلف ہیں۔اس کے علاوہ ایک لحاظ سے الفاظ کی قسمیں (Morphology) اور آواز (Phonology) بھی مختلف ہیں۔ظاہر ہے ایک زبان کے مستقبل کے لئے یہ بہت اہم مسئلہ ہے۔یہاں سے گزرنے کے چار راستے ہیں اور چاروں مسائل سے پر ہیں۔

(۱) جس حالت مین زبان ہے اسے ویسے ہی چھوڑدیں۔ اسے معیاری بنانے کی کوشش نہ کریں اور تعلیم یا عام استعمال میں اسے نہ لائیں۔

(۲) ان میں سے ایک لہجہ کو اسٹینڈ ڈائز (Standardies) کریں مثلاً مغربی لہجہ کو اور یہ امید رکھیں کہ مشرقی لہجہ میں بات کرنے والے اسے بہت زیادہ اجنبی نہیں مانیں گے اسے سمجھیں گے اور اپنی مادری زبان کی طرح استعمال میں لائیں گے۔میرے خیال میں معقول وجہ ہے کہ مغربی لہجہ میں بات کرنے والے آسانی سے مشرقی لہجہ کو معیاری نہیں مانیں گے۔

(۳) مغربی اور مشرقی لہجوں کو ملا کر سٹینڈرڈائز (Standerdies) کریں۔لیکن یہ وہی کوشش ہے جو ۱۹۹۱ء میں مادری زبان میں تعلیم کے پروگرام میں ہوا اور زیادہ کامیاب دکھائی نہیں دیا (نوٹ:۔ ۱۹۹۱ء میں جو کوشش بلوچی میں تعلیم کے سلسلہ میں ہوا وہ ناکام نہیں ہوا بلکہ بلوچستان نیشنل الائنس کی حکومت کے بعد آنے والی کمزور حکومتوں خصوصی طور پر قوم پرست وزرائے تعلیم کو اسے ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔اس وقت کوشش یہ کی گئی کہ دونوں لہجوں کا املا ایک ہو اور ہر کوئی اپنے لہجے میں الفاظ ادا کرے اور پڑھے۔(مترجم)

(۴) دونوں لہجوں مغربی اور مشرقی کو ترقی دیں اور یہ مانیں کہ کم از کم عملی میدان میں دونوں لہجے ایک دوسرے سے اتنے دور ہیں کہ ایک نہیں ہو سکتے اگرچہ یہ عمل دونوں کو جدا زبانیں قرار دینے کے مترادف ہے۔ یہ فیصلہ شاہد بہتوں کے لئے قابل قبول نہ ہو۔

ان چاروں میں سے ایک بھی بہت زیادہ پسندیدہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ لہجہ سے منسلک نسلی مسئلہ کو تیزی سے اٹھائیں گے۔ عمل کا نہ ہونا آگے نہ بڑھنے کی سب سے بڑی وجہ ہے جو آج تک سامنے آرہا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ اگر بلوچی کو تعلیم اور دیگر عام میدانوں میں استعمال میں نہ لایا گیا۔ تو پھر ہمسایہ اور سرکاری زبانیں دوسرے بہت سے میدانوں میں اپنی استعمال سے بلوچی کو چاٹتی جائیں گی۔

لہجہ کی صحیح ترتیب:

تعلیم اور دوسرے عام استعمال کے لئے یہ ضروری ہے کہ زبان کی کوئی معیاری شکل اپنائی جائے۔ جب یہ فیصلہ ہو جائے کہ کونسا لہجہ اپنانی ہے پھر یہ بھی ضروری ہے کہ الفاظ گرائمر رسم الخط، املا کا مستقل فیصلہ کیا جائے ان تمام مسائل پر ڈاکٹر کارینا جاہانی نے تفصیل سے بحث کی۔

یہ بہت سود مند ہوا کہ ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر کارینا جاہانی کی کتاب-بلوچی زبان کی سٹینڈرڈائزیشن اور رسم الخط شائع ہوئی تو بلوچستان صوبہ میں پہلے سے منتظر ماردی زبان میں تعلیم شروع ہوئی جیسا کہ اوپر کہا گیا مشرقی اور مغربی بلوچی لہجوں کے رسم الخط (املا) کو ایک بنانے کی کوشش میں پانچ نئے ملے ہوئے نشان (حروف) اپنائے گئے اور وہ پانچ نشان یہ ہیں۔

(۱) ف‍پ پ اور ف کے لئے جیسے لاپ یا لاف

(۲) ٹ ت اور ث کے لئے جیسے مات یا ماث یا ماس

(۳) ڎ د اور ذ کے لئے جیسے واد یا واذ

(۴) خں ک اور خ کے لئے جیسے گنوک یا گنوخ

(۵) غں گ اور غ کے لئے جیسے ورگ یا ورغ

جب مغربی اور مشرقی لہجوں کے رسم الخط کو ملا کر معیاری بنانے کی جرات مند (Valiant) کوشش ہوئی تو وہ بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئی اور ۱۹۹۱ء میں جب سکول کی پہلی جماعت کے لئے دوبارہ کتاب شائع ہوئی تو ''نئے نشان'' (حروف) ترک کئے گئے اور زیادہ مغربی لہجہ اپنایا گیا۔ حقیقت میں لہجہ کے بہت سے اختلافات کو مشرقی لہجہ کے صحیح لکھنے (Spelling) سے کافی حد تک پُر کیا جاسکتا ہے۔ جو مغربی لہجہ کے آواز کی پہچان (Phonology) سے زیادہ ہیں مثلاً بہت سے مشرقی لہجہ میں بات کرنے والے۔ ''ف'' کو ''پ''، ''خ'' کو ''ک'' اور ''غ'' کو ''گ'' پڑھتے ہیں لیکن ''ث'' اور ''ذ'' کا مسئلہ آسان نہیں۔ جبکہ ''ث''، ''س'' پڑھا جاتا ہے۔ (''ماس'' کے لئے صحیح ہے لیکن ''کتہ'' کے لئے نہیں) اور ''ذ'' جیسے ''ز''۔ جیسا کہ کہا گیا کہ مشرقی لہجہ کی صحیح لکھنے (Spelling) کی تعداد جو مغربی لہجہ سے زیادہ ہے بولنے میں زیادہ مسئلہ نہیں لیکن لکھنے میں مسئلہ ہو سکتا ہے۔ اس طرح جو اپنی زبان میں لکھنا (Spelling) چاہیں چاہے وہ دوسری زبان مثلاً اردو فارسی میں مکمل لکھ سکتے ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی زبان کے رسم الخط اور صحیح لکھنا (spelling) جو معیاری زبان کا ہو، فی البدیع (Intuitively) جان نہ سکیں مثلاً سید ہاشمی کے رسم الخط کے بارے میں یہ صحیح ہے۔ سید ہاشمی کا

مار فو فونمیک (Morphophonemic) جو خاص فونومیک (Phonemic) سسٹم کے بالکل الٹ ہے۔ پڑھنے والوں کے لئے آسان ہے کہ وہ ہو موفونک مارفیمز (Homophonic Morphemes) میں تمیز کریں۔ لیکن جو اس طرح لکھنا پڑھنا چاہیں۔ انہیں کچھ خاص سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے (دیکھیں خاص (e)ء مرفیم کے لکھنے کے سات مختلف طریقے ہیں) اس کی وجہ سے بہت سے بلوچ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ نہیں جانتے کیسے اپنی زبان کو لکھیں اور مجبوراً دوسری زبان میں لکھنا بہتر سمجھتے ہیں معیار (Standard) تجویز کردہ عمل نہیں ہونی چاہئے شاید سب سے بہتر طریقہ اس مسئلہ کو سلجھانے کا یہی ہے کہ لوگ جس لہجہ میں بھی لکھیں بات کریں یا جو رسم الخط اپنائیں وہ غلط نہیں ہیں۔ (شاید کچھ یہی کریں گے) لیکن ایک خاص مقصد کے لئے جو زبان استعمال ہو وہ معیاری (Standardies) ہو جہاں تک مادری زبان مین تعلیم کے پروگرام کا سوال ہے۔ ایک معیار اپنانا لازمی ہو گا لیکن ضروری نہیں کہ یہی معیار دوسرے استعمال کے میدانوں میں بھی مخصوص ہو بہرحال اگر پانچ لاکھ بلوچ ایک لہجہ میں جو سکولوں میں پڑھائی جاتی ہو پڑھ لکھ جائیں تو پھر ہر ادیب، ادیبہ کے لئے یہ سودمند ہو گا کہ اسی طرح لکھے تاکہ پڑھنے والے اس کی تحریر کے مواد کو پڑھ سکیں۔ فیش مین (Fishman) ۱۹۹۱ء میں سکولوں میں مانی گئی معیار (Standard) کے مقابلے دوسرے لہجوں کو برداشت کرنے کے سوال پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں۔

یہ مسئلہ اس طرح سب سے بہتر انداز میں حل ہو سکتاہے کہ زبان کی تبدیلی کو دوبارہ اصل حالت میں لانے (Reversing Language Shift) کی کوششیں مقامی لہجوں کو قبول کریں، استعمال میں لائیں اور عزت دیں (یقینی طور پر

پرائمری سکولوں اور یہاں تک کے عام ایجنسیز اور کاموں میں) انہیں معیاری زبان کے برابر یا معیاری زبان سے بھی ترجیح دیں۔ اساتذہ ضروری ہے کہ ہمیشہ حالات کی بنیاد پر شروع کے کلاسوں میں لہجہ کی باتوں کو مانتے ہوں چاہے زبان کو اصلی حالت میں لانے (Reversing Language Shift) کا کام ہو رہا ہو یا نہیں۔ اساتذہ لازمی طور پر طالب علموں میں لہجہ کو ماننے کی روایت ڈالیں۔ اس کا لحاظ رکھے بغیر کہ کلاس میں ایک دو یا زیادہ لہجے موجود ہیں۔ مقامی لہجوں کا برداشت نوجوانوں میں بھی رواج دیا جانا چاہیے۔ معیار (Standerd) مقامی لہجوں کو نہ تو دھکیلتا ہے اور نہ ان کی جگہ لے لیتا ہے۔ بلکہ وہ انہیں اس طرح مکمل کرتا ہے کہ جن میدانوں میں وہ خود پورے نہیں اترتے وہاں انہیں پورا کرتا ہے۔

زبان ایک مظہر کی انتہا ہے (language is a bottom up phenomenon)۔ زبان کے حقوق کو یکطرفہ بے دردی سے کچلنے سے زبان کے ساتھ کیا ہوتا ہے یہ ایک تعلیم یافتہ سے نہیں بلکہ عام لوگوں کے ہجوم سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ زبان کی جو خاص قسم تعلیم میں استعمال ہوتی ہے وہ زبان کی سمت کو اس طرف متعین کرنا شروع کرتی ہے جس طرف اسے جانا ہوتا ہے، لیکن امید ہے زبان کو وسیع کرنے میں دوسرے لہجے جو خزانہ لاتی ہیں ان کے لئے کافی جگہ موجود ہے۔ بلوچی ایک ایسی زبان ہے جسے خدا نے مختلف لہجوں اور متبادل لفظوں کے خزانوں سے نوازا، جس کی گواہی بلوچی زبان سیکھنے والا ہر نوجوان دے گا۔ یہ بڑی شرم کی بات ہوگی اگر اس خزانہ کو ضائع کیا جائے چاہئے یہ زبان کی مضبوطی کے لئے کیوں نہ ہو جو معیار (Standarisation) سے آتی ہے۔ رسم الخط اور املا (Spelling) کے بارے کوئی مورثی اثاثہ نہیں جس میں ایک سے زیادہ لکھنے کے طریقے ہوں۔ زبان

کی مستقبل کے لئے لکھنے کی ایک مخصوص طرز سے وابستہ رہنے کی بجائے زبان کا زیادہ سے زیادہ استعمال بہت ضروری ہے۔ زبان کے لئے کئی درجن ادیب جن کو معیار پر عبور حاصل ہو سے کئی لاکھ پڑھے لکھے لوگ جو روایتی غیر معیاری رسم الخط استعمال کرتے ہوں لاکھ درجے بہتر ہیں۔

زبان کادائرہ اثر:

جیسا کہ اوپر کہا گیا بلوچی زبان کی کامیابی اور بقا کے لئے ضروری ہے کہ جتنے بھی میدانوں میں ممکن ہو، اسے استعمال میں لا یا جائے اس کا مطلب ہے اس دوران جب اس کا استعمال تعلیم، صحافت، تجارت، کاروبار اور ٹیکنالوجی میں ہو گا تو صاف ظاہر ہے بلوچی زبان خود متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ان نئے میدانوں کو عبور کرنے کے لئے اسے اپنے الفاظ کے ذخیرے کو وسعت دینی ہوگی۔ زبان کی یہ ترقی اور توسیع بولنے والوں کے استعمال سے قدرتی طور پر خود بخود ہوتی ہے۔ تعلیم کے دوران نئے مضامین میں نئے الفاظ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس طرح امکان ہے کہ تعلیم کے ساتھ نئے الفاظ زبان میں شامل ہونگے لیکن یہ عمل خطرات سے خالی نہیں۔ ڈرسلر (Dressler) ۱۹۸۲ء میں کچھ یورپی اقلیتی زبانوں پر تحقیق کے بعد یوں کہتا ہے کہ "سٹینڈرڈ کو خالص اور جدید بنانے کے عمل نے سٹینڈرڈ بریتون (Breton) سلوینین (Slovinion) اور کرواشین (croation) زبانوں کو اپنے اپنے اقلیتوں کے لئے سمجھنا مشکل بنا دیا۔ ایک زبان کو بڑی حد تک خالص کرنا ہو سکتا ہے حقیقت میں اسے کمزور کرے اگر تبدیل شدہ یا مستعار لئے ہوئے الفاظ غلط دیکھے جائیں تو ممکن ہے یہ اس زبان میں بات کرنے والوں کو چند موضوع پر بولنے میں مشکل پیدا کریں یا بالکل ناممکن بنا دیں"۔ ایک بلوچ نوجوان جس سے میں ملا، ان کو کہانیاں اور ڈرامہ (Play) لکھنے کی صلاحیت تھی اردو میں کئی ڈرامے لکھنے کے بعد اس نے ایک ڈرامہ (Play) بلوچی میں اپنے لہجہ میں لکھا لیکن ایک بلوچ ادیب نے اسے کہا کہ یہ صحیح بلوچی نہیں ہے۔ اس طرح اس نے اپنا لکھا ہوا ڈرامہ پھاڑ دیا اور اب وہ صرف اردو میں ڈرامے لکھتا ہے۔

دوسری طرف وہ لوگ جو اپنی مادری زبان میں مستعار لئے ہوئے الفاظ ہر موضوع پر بات کرتے ہوئے آزادی سے استعمال کرتے ہیں۔ جیسے کہ وہ اپنے دوستوں سے بات کرتے ہیں وہ اپنی زبان کو زیادہ استعمال کر کے مضبوط کر رہے ہیں۔ جتنا کہ ہم زبان کے بارے میں جانتے ہیں یہ عمل بالکل صحیح ہے۔ یہ ایک وسیع لاشعوری عمل ہے۔ اگر بولنے والے اپنی باتیں شعوری حساب کتاب سے کریں تو وہ اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ غیر زبان میں بات کر رہے ہوں۔

لوگوں کی قبولیت:

زبان کو معیاری (Standardies) کرنے کا ایک حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو دوسرے لہجوں میں بات کرتے ہیں ہو سکتا ہے، معیار انہیں دور اور غیر بنادے بہت سوں کا بلوچستان میں مادری زبان میں تعلیم پر ردعمل اسی بات کو ظاہر کرتا تھا۔ مغربی اور مشرقی لہجوں کے گروپ بندی کی وجہ سے جو ہوا وہ ایک مسئلہ تھا۔ لیکن یہ مسئلہ ان تمام کے ساتھ اٹھ سکتا ہے جو سٹینڈرڈ کے علاوہ دوسرے لہجوں میں بات کرتے ہیں۔ اگر مادری زبان میں بنیادی تعلیم کامیابی سے پاکستانی بلوچستان میں رکھ دی جاتی پھر بھی یہ سوال باقی رہتا کہ سندھ، پنجاب، ایران، افغانستان، ترکمانستان اور خلیج میں بلوچی بولنے والے نافذ کردہ سٹینڈرڈ زبان سے کیسے نزدیک اور منسلک ہوں۔ بلوچی زبان کے مستقبل کو نقصان ہو سکتا ہے اگر ان ملکوں میں رہنے والوں کو محسوس کرایا جائے کہ جب تک وہ سٹینڈرڈ قسم کی زبان میں بات نہیں کریں گے ان کی بلوچی صحیح نہیں ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ان کے لئے بہتر ہے کہ وہ اپنے کو اُردو، فارسی، ترکمانی اور عربی تک محدود کریں۔

ڈرسلر (dressler) کہتا ہے اقلیتی زبان کو مٹنے سے بچانے کے لئے لازمی ہے کہ اسے اسٹینڈرڈ کیا جائے لیکن اسٹینڈرڈ اور مقامی لہجوں کے درمیان دوری و جدائی سٹینڈرڈ زبان کے پڑھانے کو مشکل بناتا ہے۔ بریتانی (Brittany) میں اسٹینڈرڈ برتون (Breton) کم از کم لہجوں کی 1/3 خاص کر وانیتس (Vannetais) سے بہت مختلف ہے اس لئے بہت کم بچے برتون پڑھتے یا اس کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور نہ برتون کے مذہبی آیات یاد کرتے ہیں۔ اس معاملے میں برتون اپنے اندر رابطہ کے کردار کو گنوا رہا ہے اور ٹوٹنے کے عمل میں مصروف ہے۔

آسٹریا (Austria) کے برگن لینڈ (Burgenland) میں کروایشن زبان (croation) کے استعمال کے بارے میں وہ کہتا ہے اسکولوں میں سٹوویکین ، سربوکروایشن یا کاکاوین اور استوا کین کا ملا کر پڑھانے کی کوشش نے بہت سے طلبااور ان کے والدین کو سکولوں سے دور کر دیا اس طرح کروایشن (Croation) سکولوں میں بچوں کی تعداد بہت کم ہوگئی۔ یہاں زبان کو سٹینڈرڈ کرنے سے بہت سے لوگ مایوس ہوگئے جو زبان کے سٹینڈرڈ ہونے سے پہلے سوچتے تھے کہ وہ اس زبان میں بات کر سکتے ہیں۔

فیشمین ۱۹۹۱ء میں مختلف لہجوں (جو خطرناک حد تک کمزور ہیں اور اپنی بقاء کی جدوجہد کر رہے ہیں) کے لئے حال ہی میں منتخب اور رائج کی گئی مصنوعی سٹینڈرڈ کے منفی اثرات کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایسے حالات میں جب بچے سکول سے گھر آتے ہیں اور ایسے لہجے میں بولتے، پڑھتے اور لکھتے ہیں جو گھر ہمسایہ اور کمیونٹی کے لہجہ سے مختلف ہو۔ اس سلسلے میں یہ امکان موجود ہے

کہ یہ ایک نسل سے دوسری نسل تک سفر کرتے ہوئے پہلے سے کمزور اور مٹتی ہوئی مادری زبان کے لئے ایک اضافی نفسیاتی بوجھ بن جائے۔ وہ والدین جو یہ تاثر لیتے ہیں کہ ان کی مادری زبان اصلی یا صحیح زبان نہیں، ہو سکتا ہے وہ اپنی زبان بالکل چھوڑ دیں بر عکس اسکے کہ وہ اس کو زندہ رکھنے کے لئے بار بار کوشش کرتے رہیں۔

اختتامیہ

بلوچی کی بقا اور اسے زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جتنا جلدی ممکن ہو، بلوچی زبان کے استعمال کے میدان کو وسیع تر کیا جائے، خاص کر تعلیم اور دوسرے میدانوں میں۔ تعلیمی لحاظ سے مادری زبان میں تعلیم کی وسیع تر سماجی اور اقتصادی کامیابی کے لئے لازمی ہے کہ مادری زبان میں سماجی اور اقتصادی تحاریک (Incentives) موجود ہوں۔ مادری زبان میں تعلیم کے پروگرام کے لئے ضروری ہے کہ اس زبان کو معیاری (Standardise) کیا جائے۔ اس کے لئے لہجہ کا انتخاب سب سے مشکل پہلو ہو سکتا ہے۔ جو بھی سٹینڈرڈ منتخب کیا جائے ضروری ہے کہ وہ یہ تاثر نہ دے کہ زبان کے دوسرے لہجے صحیح نہیں ہیں۔ کوئی بھی منتخب رسم الخط، اِملا لوگوں کو اپنے لہجے میں لکھنے پڑھنے سے مایوس کرنے کا سبب نہ بنے بلکہ وہ لوگوں کو اپنی زبان کی ترقی اور تمام میدانوں میں اس کے مکمل استعمال کا وسیلہ بنے۔

بلوچی زبان کی سرگزشت

(برین اسپونر)

تعارف:

ایلفن بین کے مطابق بلوچستان (ایران، افغانستان اور پاکستان) میں جہاں جہاں تحقیق ہوئی ادیب اور ماہرین لسانیات کے مطابق بلوچی زبان بولیوں کی ایک زنجیر (series of dialects) ہے۔ بلوچ آپس میں ان بولیوں کو سمجھتے ہیں۔ فرق صرف الفاظ (vocabulary) اور بلوچی پر ہمسایہ زبانوں خاص کر فارسی کے اثرات تک محدود ہے۔ بلوچی 3 سے 5 ملین بلوچوں کی زبان ہے، جو پاکستان، افغانستان، ایران، خلیج فارس کے ممالک، ترکمانستان، مشرقی افریقہ اور دنیا کئی ممالک میں آباد ہیں۔ بلو چوں کے کئی گروہ جو اس تقسیم کے دوران سرحدوں پر تھے بلوچی بولنے والوں سے جدا (Isolated) ہو کر سندھ، پنجاب، انڈیا اور دوسرے علاقوں میں آباد ہو گئے اور بلوچی بولنا ترک کر گئے۔ بلوچ پر جدید تحقیق کرنے والوں میں سب سے اہم حصہ دار جوزف ایلفن بین اور کارینا جہانی ہیں جنہوں نے ہر ملک میں بلوچی کی سرکاری حیثیت کا لب لباب (Summarise) پیش کی، جو 1989 کے وقت بلوچی کو معیاری (standardise) بنانے اور تعلیم دلانے میں ایک فائدہ مند ثابت ہوا۔"

اگرچہ 1638 میں قلات (جو اب پاکستان میں ہے) میں ایک بلوچ ریاست موروثی خان (Dynastic Khan) کی سرپرستی میں وجود میں آئی، لیکن یہ مرکزیت نو آبادیاتی دور میں قائم نہ رہ سکی اور بلوچی کی معیاری ہونے کا موجب نہ بن سکی۔ اِس ریاست (جسے بعد میں ریاست قلات (Khanate of Kalat) کہا

جانے لگا) کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ فارسی انیسویں صدی تک مرکزی جنوبی ایشیا اوراردگرد ہر کہیں رائج تھی۔ احمد شاہ درانی نے قلات پر قبضہ کرکے اسے 1740 کی دہائی کے آخر میں وجود میں آنے والی نئی افغان ریاست میں شامل کر لیا، لیکن جلد قلات 1750 کی دہائی کے وسط میں پھر آزاد ہو گیا، اور یہ آزادی برطانوی قبضہ 1839 تک قائم رہی۔

معیاری بلوچی زبان کی تحریر کی کوششیں بلوچ قومی بیداری یعنی برطانوی قبضہ (Suzerainity1839-1947) سے شروع ہوئیں۔ جب قلات اوراسکی ماتحت ریاستیں 1948 میں پاکستان میں شامل ہوئیں تو بلوچی کو پاکستان کی قومی زبانوں میں سے ایک زبان تسلیم کیا گیا۔ بلوچی کی اشاعت میں گو کہ کچھ بولیوں کو دوسری بولیوں پر فوقیت دی جاتی رہی، اس کے باوجود کسی لہجہ کو معیار کی عام قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ سوکولوا(Sokolova-1953) نے اس وقت تک بلوچی اشاعت (Publication) پر ایک فائدہ مند تحقیق مہیا کی۔ افغانستان میں 1978 کی کمیونسٹ بغاوت کے بعد ریاست نے بلوچی کو پاکستان کی طرح قومی زبان تسلیم کیا۔ لیکن یہ کوشش بھی پاکستان کی طرح بے اثر ثابت ہوئی۔ اسطرح کی قبولیت ایران میں بلوچی کو نہ مل سکی اور نہ کسی اور ملک میں جہاں بلوچ اقلیت میں ہیں، ماسوائے ترکمانستان کے۔ اگرچہ گزشتہ جنریشن سے خطہ میں شرح خواندگی کافی حد تک بڑھی لیکن بلوچی میں خواندگی کافی سست رہی، تقریباً نہ ہونے کے برابر۔ اکثر بلوچ بچوں کو تعلیم بلوچی میں نہیں دی جاتی۔ بلوچ بچے افغانستان اور ایران میں فارسی اور پاکستان میں اردو میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اب بھی بہت کم بلوچ ان ملکوں میں بلوچی پڑھ سکتے ہیں۔ اگرچہ حروف تہجی جن میں بلوچی کی چھپائی ہوتی ہے ہو بہو اردو یا فارسی کی طرح ہیں۔ کوششوں کے باوجود کہ بلوچی

تحریری اور پرنٹ کے ذریعے رابطے کی زبان ہو مگر نہ بن سکی۔ وہ بلوچ جو اردو اور فارسی روانی سے پڑھ سکتے ہیں انہیں آسانی سے ایک صفحہ پر پرنٹ بلوچی بھی پڑھنی چاہیئے لیکن کہتے ہیں وہ اسے نہیں پڑھ سکتے۔ اگرچہ ایک غیر مقامی سپیکر کے لئے کوئی مشکل نہیں۔

(Baloch who read Urdu and Persia comfortably and could easily make out Balochi on a printed page,.claim to find it illegible, though there is no difficulty for a non-native speaker.)

یہ ایک ایسی صورتحال ہے جسکی وضاحت دونوں لحاظ سے یعنی لوگ کیسے پڑھتے ہیں؟ اور تینوں زبانوں کی تاریخی حیثیت(Historical Status) بیان کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر لوگ لفظ کے حروف کی آوازوں کی بجائے حروف کے اشکال کو غیر ارادی طور پر پہچان کر لفظ پڑھتے ہیں۔ یہ ان زبانوں کے لئے بالکل صحیح ہے جنہیں عربی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔ کیونکہ لکھنا لکھائی (خط) کی ایک مسلمہ اصول کے تحت کام کرتی ہے، اور اس میں حروف کو ایک خاص ترتیب سے ملایا جاتا ہے، نہ کہ ایک لفظ کے لئے مطلوبہ حروف کی سادہ ملاپ کافی ہے۔

(Because writing works in term of established pen-strokes including particular serial combinations of letters rather than by the simple connection of whatever letters are required to form any particular word.)

اردو میں اکثر مسلمہ لکھائی(Establish pen strokes) فارسی کی لکھائی(Pen strokes) سے مختلف ہیں اور بلوچی میں لکھائی(Pen strokes) فارسی اور اردو دونوں سے مختلف ہیں۔ جو لوگ فارسی یا اردو کے عادی

(Accustomed)ہیں ان کے لئے بلوچی املا انجانی ہے اس لئے ان کے لئے بلوچی پڑھنا بھی مشکل ہے۔عام طور پر اب بھی ایک تاریخی توقع کی جاتی ہے کہ بلوچی زبان کی لکھائی بلوچی کی بجائے فارسی یا اردو میں ہونی چاہیئے۔لیکن بلوچی میں شرح خواندگی یا الیکٹرانک میڈیا(Non oral) میں اضافہ کے بغیر بلوچی کا معیاری زبان کی حیثیت اختیار کرنا یا قومی اہمیت کا حامل ہونا مشکل ہے۔موجودہ وقت میں بلوچ اکثریتی علاقوں میں بلوچی کا استعمال مقامی سیاست اور ثقافتی پہچان کے حوالے سے کلیدی ہے اس کی وجہ تاریخی حوالے سے بلوچی زبان کی عوام میں میڈیا کے طور پر استعمال ہے۔اس کے علاوہ دوسرے گروہ جو اپنے آپ کو بلوچ کہتے ہیں لیکن ایک اور زبان کا استعمال بھی جاری رکھے ہوئے ہیں ان کے اور بلوچی بولنے والوں کے مابین بلوچی رابطے کی زبان ہے۔ہم امید کرتے ہیں اگر بلوچوں میں گزشتہ نسل (Genrration)کی طرح سماجی سیاسی یکجہتی(Identity) بڑھتی رہی پھر بلوچی کا استعمال الیکٹرانک میڈیا میں بڑھے گااور ایک معیاری زبان سامنے آئے گی۔ افغانستان ایران اور پاکستان میں بلوچ ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جو وسائل کے لحاظ سے غریب ہیں اور تاریخی لحاظ سے قومی حکومتوں نے ان پر توجہ نہیں دی۔موجودہ عالمگیریت(Globalisation) کے انداز سے لگتا ہے موجودہ حالت تبدیل ہو گی بلوچ اور بلوچی کے لئے مواقع پیدا ہوں گے اگر چہ انکی پیشن گوئی اِس وقت نہیں کی جانی چاہیئے۔

بلوچ اور انکی زبان کی گزشتہ چار صدی کی تاریخ نے بلوچی زبان کو جدید لسانی پالیسی کے مطالع(Modern Language Policy Studies) کے لئے ایک دلچسپ مقدمہ(Case) بنا دیا ہے، جس مین لسانیات، بشریات کے ماہرین ،تاریخ دان اور سائنسی سوچ کے حامل سیاستدان ،تمام کی دلچسپی

(All have a Stake) ہے۔زبان کی تبدیلی کے دوران کئی قسم کی قدرتی اعمال(Processes) کی کیفیت تفصیل سے بیان کرنے کے علاوہ اس قسم کے مطالعہ کی اہمیت یہ ہے کہ یہ عالمگیریت اختیار کرنے والی دنیامیں بین الملکی شناخت (Transnational identity)کو اجاگر کرتی ہے۔میرا مقصد اس چیپٹر میں یہی ہے کہ اس بیانیہ کو درست ثابت کروں۔میں اسکی ابتدا بلوچ تاریخ کا جائزہ (Reviewing) لینے سے کرونگا: وہ کیسے موجودہ وطن میں پہنچے اور انکے جدید گروپوں کی ترتیب کی اہمیت کیاہے۔اس کے ساتھ میں بلوچی زبان کی سلجھتی ہوئی حیثیت کے مضمرات کی جانب توجہ دلاؤنگا۔آخر میں ان ملکوں کی بلوچی کے بارے موجودہ پالیسی کا خلاصہ بیان کرونگا جنکا ہم نے دورہ (Visited) کیاہے۔

بلوچی زبان بلوچ تاریخ کے تناظر میں:

خانہ بدوش اور سکونت پذیر زراعت پیشہ لوگوں کے مابین تاریخی تعلق کے بارے ابن خلدون کا خاکہ (Model) صحیح ہے۔ قلات خانیت، کے علاوہ بلوچوں نے ذراعت پیشہ لوگوں پر قابو پانے کی کئی کوششیں کی ہونگی لیکن ان میں سے کوئی اتنا تاریخی طور مشہور نہ ہوا۔ سب سے مشہور تالپور بلوچ ہیں جنہوں نے سندھ پر انگریز قبضہ، 1843 تک حکومت کی۔ دوسری مثال لسبیلہ کی ہے جسکی بنیاد ایک بلوچ (جسکا تخلص جام تھا) نے 1742 میں رکھی۔ ان دونوں حالات میں مقامی آبادی سندھی تھے، اس کے باوجود سندھی زبان سولھویں صدی سے تقریباً تحریری زبان ہوگئی تھی شرح خواندگی بہت کم تھی اور حکمران خاندان کی زبان بلوچی تھی۔ بلوچی زبان میں لکھی سب سے پہلی عبارت (The earliest extant text) جو 1820 کے لگ بھگ لکھی گئی ایک پیغام (mess) ہے جو برطانوی میوزیم میں محفوظ ہے اور ایلفن بین نے اسے 1983 میں شائع کیا۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ وہ وقت تھا جب خطہ میں کئی تحریری زبانوں نے فارسی کے ساتھ دوڑ میں شامل ہونے کی ابتدا کی تھی۔ بلوچستان کا وہ حصہ جو برطانوی زیر تسلط تھا میں اس نوآبادیاتی دور میں بلوچی مواد کا کتابی صورت میں اشاعت آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ اس وقت پہلی بار قلات پھر لسبیلہ جو سمندر کے ساحل پر ہے اور قلات کی مغربی ماتحت ریاستیں خاران اور مکران کو برطانوی حکومت نے پرنسلی سٹیٹ (Princly States) تسلیم کیا۔ ایک صدی بعد اگست 1947 میں برطانوی ہند کی تقسیم کے سات ماہ بعد آزادی کے لئے جس مدد کی ضرورت تھی وہ نہ ملنے کی بنا بلوچستان پاکستان میں شمولیت پر راضی ہوگیا۔ اب بلوچی مغربی پاکستان کی چار میں سے ایک صوبے کی زبان بن گئی۔ پھر 1952 میں چاروں بلوچ پرنسلی ریاستیں،

قلات، مکران ،لسبیلہ اور خاران کو ملا کر مغربی پاکستان میں "بلو چستان سٹیٹس یونین "کی تشکیل کی گئی اور خان قلات کو خانِ اعظم کہا گیا۔ یہ انتظام 1955 تک چلتا رہا۔ پھر اس سٹیٹس یونین کو مغربی پاکستان کے ون یونٹ صوبہ میں ضم (Absorbed) کیا گیا۔ اس کے ساتھ برطانوی بلوچستان جسکی سرحد افغانستان سے ملتی ہے (جسے پہلے کلکتہ اور پھر دہلی سے کنٹرول کیا جاتا تھا) بھی شامل تھا۔ موجودہ پاکستانی صوبہ بلوچستان جس میں سابقہ تمام حصے شامل ہیں، 1971 میں مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بعد بنایا گیا۔ اس وقت سے بلوچوں میں کئی تحریکیں اٹھیں۔ جن کے لیڈر وہ لوگ تھے جو پاکستان میں انضمام سے مکمل اتفاق نہیں کرتے تھے یا پاکستان سے آزادی چاہتے تھے یا کم از کم مرکزی حکومت (پہلے کراچی اب اسلام آباد) سے تعلقات پر دوبارہ بات چیت چاہتے تھے۔ طارق رحمان (1966) نے بلوچی کی درجہ بندی پاکستان کے 65 زبانوں میں سے ایک کی حیثیت سے کی۔ انکے مطابق بلوچی 6 سرکاری زبانوں میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ وہ زبان نہیں جو قومی لحاظ سے تسلیم شدہ ہو یا فائدہ مند قابلیت

(But not one that can be used for any form of nationally recognised or useful qualification.)

کے لئے استعمال ہوتا ہو۔ طارق رحمان کے مطابق بلوچی 3.57٪ بلوچوں کی زبان ہے۔ اس کے مطابق بلوچی ایک مضبوط شناخت کی علامت (Strong identity symbol) ہے۔ اگرچہ بلوچستان صوبہ ملک کے 43٪ رقبہ پر مشتمل ہے اور بلوچی اس صوبہ کی بڑی (Primary) زبان ہے لیکن اس زبان کی معاشی اور سیاسی فوائد کے حوالے سے کوئی اہمیت نہیں ہے۔

(But of no value for either economic or political advantage)

بلوچوں اور خاصکر مری اور بگٹی قبائل کی جو بلوچستان کے شمال مشرق میں ہیں اسلام آباد کی مرکزی حکومت سے عداوت بڑھی۔1973 میں عراقی سفارت خانہ سے ہتھیاروں کی بر آمدگی (جنہیں مبینہ طور پر مری علاقہ پہنچانا تھا) کی وجہ سے بلوچ شورش کو دبانے کے لئے حکومتی کوششیں اپنی بلند ترین سطح پر پہنچیں۔ اس کے نتیجہ میں بلوچ سیاسی شناخت کی سوچ میں اضافہ ہوا۔1974 میں مریوں نے مکمل بغاوت کی کچھ نے جنوبی افغانستان میں ہجرت کی جہاں وہ دس سال سے زیادہ عرصہ تک رہے لیکن مسلہ حل نہ ہوا۔نام کی حد تک بلوچوں کو جدید پاکستان میں کافی صوبائی خود مختاری حاصل ہے جس کے تحت انتخابات ہوتے ہیں اور صوبائی حکومت بنتی ہے۔ بہر حال بلوچ اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے میں مکمل ناکام رہے۔اسکی ایک وجہ برطانوی دور میں پر نسلی سٹیٹس کی بنیاد پر لوگوں کی تقسیم ہے اور دوسری وجہ افغانستان کے ساتھ برٹش بلوچستان کی بڑی پشتون آبادی کا بلوچستان میں شامل ہونا ہے۔

بلوچ اور پشتون تعلقات پیچیدہ ہیں کیونکہ دونوں میں سیاسی مرکزیت نہیں۔ تاریخی اور ثقافتی لحاظ سے وہ آپس میں نزدیک ہیں۔ بلوچی اور پشتو دونوں ایرانی زبانیں ہیں۔ لیکن انکا آپسی تعلق دور کا ہے۔ آپس میں بالکل سمجھ نہیں پاتے۔ اگر پہلے نہیں تو اٹھارھویں صدی کے نصف میں جب بلوچ افغان سلطنت میں ضم کیے گئے شمالی بلوچستان میں افغانستان بارڈر کے دونوں جانب ایک عبوری زون (Tramsitional Zone) ہے جہاں دونوں شناخت کے لوگ آباد ہیں۔ شواہد ہیں کہ پچھلے دو سو سال کچھ پشتون بلوچ شناخت میں جذب (Assimilated)ہو گئے۔بارتھ (Barth)نے 1966 میں اس عمل (Process)کی ایک دلچسپ توضیح (Explanation) بیان کی کہ گزشتہ

صدی کے نصف میں پشتونستان کی تحریک جسکی سرپرستی کابل کر رہی تھی نے تمام بلوچستان کو پشتونستان کا حصہ قرار دیا۔

ایران میں بلوچوں کی سیاسی تحریک مختلف ہے لیکن باہم جڑی (Interrelated) ہے۔ یہ فرق کسی حد تک قلات سے دوری اور خان کے دسترس سے باہر ہونا ہے، لیکن اہم وجہ بڑی حکومتوں کابل، دہلی اور تہران کی اس خطہ میں مفادات میں اختلافات تھے۔ سیاسی تحریکیں تہران کے مرکزی حکومت کے خلاف اس طرح کی ہیں جیسے پاکستانی بلوچوں کے اسلام آباد کے خلاف ہیں، لیکن انیسویں صدی کے شروع میں ایک نیا عنصر سامنے آیا بارکزئی نسل کی شاخ جو شاید افغانستان کے پشتون حکمران قبیلہ درانی سے ہے سارا وان کے بلوچوں میں ظاہر ہوا (سارا وان اب ایرانی صوبہ بلوچستان سیستان ہے) کیونکہ یہ ہرات میں درانی قبیلے کے دو بڑی شاخوں کی آپسی لڑائی (1817-1819) کے بعد جلد سامنے آیا ممکن ہے ہجرت اس لڑائی سے ہوا ہو، لیکن اسکا کوئی تحریری ثبوت نہیں اور نہ کوئی یاداشت میسر ہے۔ آہستہ آہستہ ان بارکزیوں نے سارا وان، بمپور اور مغربی مکران میں مقامی لیڈرشپ کی جگہ لے لی اور بلوچ شناخت میں ضم ہو گئے۔ اس لیڈرشپ کی حیثیت مکران اور خاران کی طرح تھی جو برطانیہ کے وقت (Princely State) پرنسلی سٹیٹ بن گئے لیکن ریاست کی ایرانی تصور (Concept) کسی قسم کی خود مختاری کو تسلیم نہیں کرتی۔ ایرانی بلوچستان میں کئی اور ذرعی آبادیاں ہیں جن کے نام بلوچی نہیں۔ یہ اسلام اور بلوچوں کی یہاں آمد سے پہلے آباد چلے آرہے ہیں۔ ان میں سے کئی کے بارکزئیوں کی طرح مقامی حکمران تھے جو غیر بلوچ ہونے کا دعوی کرتے تھے۔

جب1830 کی دہائی میں محمد شاہ کی کوششوں کے باوجود کہ بلوچستان میں اپنی حاکمیت قائم کرے،اس کے گجر (Qajar) جانشینوں نے اس دور دراز علاقے میں دلچسپی لینا چھوڑ دی توبارکزئی طاقت اور اسکی مقامی حکمرانی بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں بڑھی۔ پھر جب رضاشاہ پہلوی نے 1925 میں گجروں کو معزول کرلیااور اپنی نئ قوم پرست جدید حکومت قائم کی تواس نے ابتدائی سال ایران کے تمام علاقوں(جن سرحدوں کی نشان دہی 1871 میں انگریزوں اور روسیوں کے ساتھ گفت وشنید میں طے پائی)پر حکومتی رٹ بحال کرنے میں صرف کی۔ سابقہ حکمرانوں کی طرح بلوچ اسکے لسٹ میں آخر میں تھے۔ انہوں نے آخر کار 1928 میں ایک فوج بلوچوں کے خلاف بھیجی جس کی قیادت جنرل امیر امان اللہ جہاں بانی کر رہے تھے۔اس فوج کو دوست محمد بارکزئی کے پیروکار (Incombent) قبیلوں کے اتحاد کو(جو اکھٹے ہوئے تھے)شکست دینے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

ایک بلوچ ریاست قائم کرنے کے لئے دو کوششیں جس میں تمام یاتقریباً سب بلوچوں کوشامل کرنا تھا۔ قلات میں احمدزئی اور بمپور میں بارکزئی خاندان نے کیں،دونوں بیسویں صدی میں اپناوجود قائم نہ رکھ سکے۔ لیکن یہ حقیقی کوششیں بلوچوں کوکرد اور آزری بولنے والوں سے ممتاز کرتی ہیں جو اپنا کوئی مرکزیت قائم نہ کرسکے ماسوائے چند دنوں (Ephermerally) جو دوسری عالمی جنگ کے بعد سوویت مدد سے ممکن ہوئی۔ اگرچہ بلوچ اپنے لیڈروں کے لئے قابل بھروسہ جنگجو نہیں رہے تھے اس کے باوجود وہ ہمیشہ دوسروں کے لئے لڑنے پر تیار تھے۔

(However, although the Baloch were not reliable fighters for their own leaders, they were always ready to fight for others.)

خاص کر انہوں نے انیسویں صدی میں خلیج فارس اور مغربی بحر ہند میں مسقط سلطنت کے لئے فوج بنائی۔ زنزیبار(Zanzibar)میں 1963 کی انقلاب تک رہے(شروع میں زنزیبار میں وائسرائے کی طرح کام کیا)مشرقی افریقہ میں تجارت کی،وہ مغرب کی جانب گانگو تک گئے(جہاں 1950 کی دہائی میں ایک علم الانسان Ethnographer نے کچھ کی نشاندھی کی)بہت سے بلوچ قبیلے شروع سے اومان میں بس گئے اور عربی زبان اختیار کی۔ کئی نے خلیجی ریاستوں سے تجارتی تعلقات استوار کئے جو آج تک چلے آرہے ہیں۔برطانوی دور میں بلوچوں کے لئے تجارت اور ملازمتوں کے کئی مواقع تھے۔کچھ نے بحری تجارت کی اور دنیا کے مختلف ممالک کا انہیں تجربہ ہوا۔اسی دوران مشرقی ایران میں عالم فیملی (Alam Family)،(جو افغانستان کے درانی بادشاہوں کی طرح)نادر شاہ کے ایک جنرل کی اولاد سے تھے(اسی وقت سے قائنات (Qa'enat) جو بعد میں مشرقی ایران کہلایا،میں مضبوط ہوئے)نے اپنا اثر رسوخ جنوب کی جانب سیستان بلوچستان تک بڑھا دی اور بلوچوں کو محافظ (retainers) کی طرح استعمال کیا۔یہ ممکن ہے بلوچ ایرانی بلوچستان کے شمالی حصہ جو آزاد سرحد (lit.boarder land)ہے اس وقت سے شمال کی جانب لوٹ مار کرتے تھے لیکن انیسویں صدی سے عالم فیملی سے تعلقات نے انکی مزید حوصلہ افزائی کی۔ 1950 کی دہائی تک بلوچ مرکزی ریگستان کے شمال اور اسفارا (Esfara)کے مغرب میں شمال مغربی خراسان (ایران) میں بھی آباد تھے۔وہاں سے کچھ مزید شمال کی جانب گئے اور ترکمانستان میں آباد ہوگئے۔

بلوچوں کی ایسی منتشری یہ سوال کھڑی کرتی ہے کہ بلوچ ایک ثقافتی،لسانی اور سیاسی شناخت(Political Identity)اتنے وسیع سرزمین پر کیسے قائم رکھ

سکے ہیں جبکہ کوئی ایسی قوت نہیں کہ انہیں اکھٹے رکھ سکے،نہ انکا کوئی مرکز ہے اورنہ مرکزی حکمران،نہ تحریری زبان(Written Language) اورنہ مختلف بولیاں بولنے والے دور درازرہنے والے لوگوں کے مابین ذرائع آمدرفت موجود ہے۔اس سوال کا جواب لگتا ہے انکے ثقافتی اہمیت میں ہے ، جسے وہ چرا گاہیں ڈھونڈنے والے خانہ بدوشی اوربندوبستی زراعت کی بجائے موبائل زرعی زندگی سے منسوب کرتے ہیں۔

(The answer to this question appears to lie in the cultural significance they attributed to pastoral nomadism and a mobile rather a settled agricultural life.)

زبان نے اس عمل میں جتنا کردار ادا کرناتھاوہ بارتھ (Barth 1964) نے متعارف (Introduced) کیا۔یہاں میں بارتھ کے دلائل کالب لباب بیان کرونگااورانکی اپنے تجربے کے مطابق تشریح کرونگا۔

بلوچی بلوچ شناخت کی کسوٹی کی حیثیت سے:

بلوچوں کو یکجا رکھنے اور انہیں شاید کسی حد تک پھیلنے میں مددگار انکی مشترکہ شناخت کی سوچ (Sense)ہے جو اجنبیوں کو ادارہ جاتی ضابطوں کے تحت قبول کرنے کے سلوک میں پوشیدہ ہے۔ان ضابطوں میں زبان ایک بنیاد تھی لیکن زبان کی لازمی معیاری ضابطے اس کے لہجوں میں بکھرے ہوئے تھے۔

(The Baloch have been held togather, and perhaps even able to expand, because their sense of common identity lay in acceptance of institutional forms of behaviour among strangers, forms in which language was a central component, but the necessory standard forms were shared across the dialects.)

کسی غیر کو بلوچ بننے کے لئے اسے صرف وہ کرنا ہوتا ہے جو بلوچ کر رہے ہوتے ہیں۔ بلوچوں کی ایک مراتب والی سماج(Hierarchical society) رہی ہے انکا کلچر زبانی رہاہے۔ اسکو بلوچ ماناجاتا ہے جو بلوچ اقدار کو عملی صورت قبول کرے۔ جو ظاہر کرتا ہے کہ اس نے بلوچ سماج میں ایک مقام حاصل کی ہے۔ بارتھ(Barth) کے مطابق عام طور پر بلوچوں کے زندگی میں سب سے اہم ادارے مجلسیں سجانا اور معلومات کا تبادلہ ہیں۔

بلوچ آداب اور تکلفات اگر انکا ایرانیوں سے مقابلہ کیا جائے تو کم ہیں، ماسوائے قریبی دوستوں کے۔ بلوچ ہمیشہ بردبار اور اپنے رسوم کا پابند رہے ہیں۔ وہ مختصر اور پر مغز گفتگو کرتے ہیں ۔ اگر کوئی دوسرے کے گھر جائے تو وہ روایتی اسلامی الفاظ، ''اسلام و علیکم ''کہتاہے، یعنی تم پر سلامتی ہو۔ پھر رتبے میں برابر یا کم اسکے سامنے اٹھ جاتے ہیں۔ آنے والا اپنے میزبان یا دوسرے جو وہاں موجود ہوں سے ہاتھ ملاتا ہے۔ میزبان لازمی گھر کا مالک نہیں ہوتا، سب سے زیادہ معتبر جو اس گھر میں ایک دن سے زیادہ رہ رہا ہو مالک کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔ اس طرح اسکی موجودگی کو گھر کے میزبان کی طرح لیا جاتا ہے۔ پھر آنے والا وہاں بیٹھتا ہے جہاں میزبان اسے بیٹھنے کے لئے کہتا ہے۔ میزبان مہمان کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور کہتاہے، ''خوش آمدید، آپ خیریت سے ہیں''۔ مہمان بھی جواب میں کہتاہے، ''خوش آمدید، آپ ٹھیک ہیں''۔ پھر میزبان مہمان سے کہتاہے حال دیں یعنی بات کریں، رواجی طور پر مہمان تمام حال یعنی خبریں جو اس کے پاس ہیں انکا لب لباب بیان کرتا ہے۔ جیسے وہ کہاں سے آیا ہے ،اگر جان پہچان نہیں تو اپنا تعارف کرتاہے، اس نے راستے میں کیا دیکھا، جہاں سے وہ آیاہے وہاں کی تازہ خبریں، خانہ بدوشی کی زندگی میں ہو تو وہ اب کہاں رہ رہاہے اور آخر میں اپنے آنے کا مقصد

بیان کرتا ہے۔ پھر میزبان سے مہمان حال مانگتا ہے اور اسی طرح میزبان حال دیتا ہے۔ مہمان تمام کی صحت کے بارے پوچھتا ہے اور گھر کے ان افراد کے بارے جن کو وہ جانتا ہے۔وہ ایسے جملوں کا تبادلہ کرتے ہیں جیسے،جو ڑئے۔ ڈڈئے۔ شر ڈڈئے۔ بہت سے علاقوں میں مہمان کو تیسرے دن تک مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے آنے کی وجہ کیا ہے۔ کسی فیصلے کے وقت یا مجلس میں جو سینئر ہوتا ہے یا معتبر وہ پہل کرتا ہے یعنی وش آختے کہتا ہے۔(میں نے کبھی اس بات پر اختلاف نہیں دیکھا کہ کون سینئر ہے)اگر کوئی گھوڑے پر سوار ہو تو وہ ملنے کی جگہ سے دس گز یا اس سے بھی دور اترتا ہے،پھر وہ ایک دوسرے کی جانب بڑھتے ہیں،سلام و علیکم کرتے ہیں،ہاتھ ملاتے ہیں اور ایک دائرے میں بیٹھتے ہیں۔اگر متعلقہ آدمی اس دن پہلے ملے ہوں یا اگر وہ آدمی مقامی ہو تو پھر اس عمل کو مختصر کیا جاتا ہے،ترک نہیں کیا جاتا۔عام بلوچی لفظ خبر کے لئے "حال" ہے(عربی میں حال کے معنی حالت۔ صورتحال، حقیقت کے ہیں)حال خوشدلی اور اطمینان سے دیا اور لیا جاتا ہے۔حال کے دو بڑے مواقع وش آختے، اور دیوان (ساسانی میں استعمال 'کورٹ' کے)ہیں۔ادارہ جاتی اجتماع (Institutionalized Gathering) اکثر اوقات کسی بڑی شخصیت سے منسلک ہوتی ہے۔

گزشتہ نصف صدی سے ملکی سطح پر سماجی میل جول بڑھنے کی وجہ سے بلوچوں کی زندگی میں تبدیلی کے باوجود، ان رواجوں کو اب بھی پزیرائی حاصل ہے،اور انکی ثقافتی اہمیت بر قرار ہے۔ہو سکتا ہے زبان کی اس خدمت کا تعلق تاریخ کے کسی خاص عہد میں بلوچوں اور انکے ہمسایوں کے مابین تعلقات استوار کرنے سے ہو۔یہ سمجھنا آسان ہے کہ بلوچ حکمران اپنا مقامی انتظام چلانے کے لئے خط و کتابت کی بجائے حال و حوال کا سہارلیتے ہوں اور اسطرح بلوچ حکمرانوں کے

دور میں حال کے رواج نے جنم لیا اور اسکی نشو نما ہوئی ہو، اگر چہ اسکا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ آج بلوچی ایک تحریری زبان ہے اور گزشتہ پچاس سال سے دور دراز میل جول میں آہستہ سے تحریری صورت میں پروان چڑھ رہی ہے پھر بھی حال وحوال کا رسم جاری ہے۔ لیکن بہت کم بلوچ بلوچی پڑھ سکتے ہیں اور اس سے بھی کم بلوچی لکھ سکتے ہیں اور جو لکھ یا پڑھ سکتے ہیں پاکستان میں ہیں۔

بلوچی میں تحریر کی بنیاد انیسویں صدی میں غیر ملکیوں اور زیادہ تر مبلغوں (Missionaries) نے رکھی۔ بلوچوں کے مفاد کو کئی جلدوں کی بلوچستان ضلعی گزیٹیر (Balochistan District Gazetteer Series) کی ترتیب وار اشاعت نے تقویت پہنچائی، جو 7-1906 میں شائع ہوئیں۔ جن میں زبان جس سے شناخت کی سوچ اور ثقافتی زندگی منسلک ہے کے بارے کافی معلومات ہیں، یہ کہیں بھی ناخواندہ بلوچ لوگوں کے لئے سب سے اچھی دستاویزات ہیں۔ سب سے پہلا ادبی دستاویز ''بولان'' تھا جو شاید آزادی سے بھی پہلے 1930 کی دہائی میں ہفتہ وار کوئٹہ سے نکلتا تھا۔ ہمارے پاس اس رسالے کی اور پڑھنے والوں کی تعداد دستیاب نہیں۔ بلوچستان سٹیٹس یونین کی 1948 میں پاکستان میں شمولیت کے بعد بلوچی میں طباعت کو وفاقی حکومت سے گرانٹ ملتی تھی۔ یہ گرانٹ 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں سب سے زیادہ (peaked) تھی، پھر کم ہوتی گئی۔

بلوچی کی حیثیت کو قومی سطح تک بڑھانے کے لئے جو اقدامات کئے گئے ان میں ریگولر ریڈیو نشریات، کوئٹہ جو صوبائی ہیڈ کوارٹر ہے میں بلوچی اکیڈمی کا قیام اور بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں بلوچستان سٹڈی سینٹر کا قیام شامل ہیں۔ 1949 میں ریڈیو پاکستان نے بلوچی نشریات متعارف کرائے۔ یہ پروگرام 45 منٹ روزانہ کی بنیاد پر کراچی سے نشر ہوتا تھا۔ پھر 1956 میں بلوچی پروگرامز صوبائی ہیڈ کوارٹر

کوئٹہ سے نشر ہونے لگے۔ کوئٹہ میں بلوچی اکیڈمی مرکزی حکومت کی مالی معاونت سے 1961 میں قائم ہوئی۔ بلوچی اکیڈمی کا کام کتابوں کی بلوچی میں اشاعت اور ادبی میٹنگز کا انعقاد ہے۔ بلوچستان یونیورسٹی میں 1997 میں قائم ہونے والی بلوچی سٹڈی سیکشن کا کام بلوچی پڑھانا اور بلوچی زبان و ادب میں ریسرچ کی سرپرستی کرنا ہے۔ پرائمری تعلیم بلوچی میں شروع کرنے کی بھی کوششیں ہوئیں۔ 1990 میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومتی اقدامات سے بلوچستان کے سرکاری سکولوں میں بلوچی، براہوئی اور پشتو کو تعلیمی زبان کی حیثیت سے متعارف کیا گیا۔ لیکن صرف دو سال بعد 1992 میں مادری زبانوں میں تعلیم کو اختیاری (Optional) مضمون کی حیثیت دی گئی اور والدین نے واپس اردو کو ترجیح دی۔ (رحمان 1996:169)۔

تصحیح: 1990 میں مرکز میں بے نظیر کی حکومت تھی اور بلوچستان میں بلوچستان نیشنل الائنس (BNA) اور جمیعت علما اسلام کی مخلوط حکومت تھی۔ نواب محمد اکبر خان بگٹی وزیر اعلی بلوچستان تھے۔ نواب بگٹی کی خواہش پر بلوچستان میں بلوچی، براہوئی اور پشتو کو تعلیمی زبان قرار دیا گیا۔ اس میں بے نظیر کا کوئی کردار نہ تھا۔ پھر جب تاج محمد جمالی وزیر اعلی بلوچستان بنے تو مادری زبانوں میں تعلیم کے پروگرام کو ترک کیا گیا جو اب تک کوششوں کے باوجود دوبارہ شروع نہ ہو سکا۔ اس میں والدین کا کوئی فیصلہ شامل نہیں تھا۔ رحمان نے اپنی کتاب میں اس بارے جو لکھا وہ درست نہیں۔ (مترجم) بلوچی پڑھانے کی پرائیویٹ کوششیں بھی ہوئیں جیسے کراچی کے بلوچ علاقے لیاری میں۔ مختلف اوقات میں کئی معیادی (Periodical) رسائل کی بلوچی میں اشاعت بھی ہوئی۔ دوسرے ملکوں میں آباد (Diaspora) کئی بلوچ بلوچی کی بقا اور ترقی کے لئے میگزین کی اشاعت، بلوچی پڑھانے، اور ثقافتی شام کا اہتمام کرتے رہے۔ آجکل کئی بلوچی میگزین کی ہفتہ وار اور

ماہانہ اشاعت ہو رہی ہے۔ ان اقدامات نے ایک لہجہ (Dialect) اور خاصکر مکرانی لہجے کی اہمیت بڑھادی لیکن بلوچی زبان کی اہمیت نہیں بڑھائی اور نہ زبان کی معیار کی جانب قدم بڑھایا۔

(Although these initiatives raised the value of a particular dialect forms, mainly Makrani, they did not raise the value of Balochi as a language or lead in any significant way towards standardization.)

یہاں موجودہ لٹریچر میں زبان اور لوگوں کی ابتدائی تاریخ کے بارے مزید تفصیل بتانا فائدہ مند ہوگا۔ بلوچی کی شمال مغربی ایرانی زبانوں میں درجہ بندی کی جاتی ہے اور اسکا کردی اور فارسی سے قریبی تعلق ہے (لیکن وہ کسی صورت آپس میں قابل فہم نہیں) اس لئے ماضی میں بلوچی کو ایرانی زبان کی ایک بولی کہاجاتا تھا جو دو زبانوں کے مابین بہتر لسانی تعلقات کی بجائے، فارسی زدہ شہری اشرافیہ اور ناخوانده بلوچ کے مابین سیاسی بیان تھا۔ بلوچ نام کے بارے اسلام سے پہلے شواہد ملتے ہیں۔ یہ ان مالدار خانہ بدوش لوگوں کا نام ہے جو کیسپین سمندر کے جنوب سے جنوب اور جنوب مشرق کی سمت ہجرت کرکے اپنی موجودہ جائے سکونت بلوچستان جنوب مشرقی ایران، جنوب مغربی افغانستان اور پاکستان کے مغرب میں آباد ہوئے۔ ماہر لسانیات جیسے ایلفن بین ٗ کا خیال ہے بلوچ کی جنم بھومی (Original Home) مرکزی کیسپین کے علاقے میں بالکل مشرق یا جنوب مشرق جہاں وسطی فارس اور پارتھین (Middle Persian and Parthian) ملتے ہیں میں کہیں ہے۔

منور سکی (Minorsky) کے مطابق سطح مر تفعٰ ایران (Iranian Plateau) کے مرکزی صحرا کے کنارے جگہوں کے نام وزٹنگ کارڈز (Visiting Cards) کی مانند ہیں جو بلوچ گزرتے ہوئے چھوڑ گئے۔ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ذراعت سے بھی منسلک رہے تھے۔ڈیمز نے جو بلوچی رزمیہ نظمیں جمع (Balochi Epic Poetry) کیں ان میں بلوچوں کے مطابق وہ شام سے آئے ہیں(گیارھویں صدی میں جب بلوچ کرمان سے گزرے اس وقت غزنی پر مسعود کی حکمرانی تھی۔غزنی اس وقت افغانستان کا جنوب مشرقی صوبہ ہے۔آخر کار وہ پندرھویں یا سولھویں صدی وادی سندھ پہنچے۔وہ اپنے ساتھ بلوچی زبان اور بلوچ شناخت لائے اور پہلے سے موجود آبادی کو بلوچائز(Balochize)یعنی انہیں بلوچ شناخت میں ضم (Assimilated) کیاہو گا۔علاقے میں موجودہ کئی نام اور ذرعی آبادیوں کے نام ان سے پہلے کے ہیں۔حقیقت یہ ہے انہیں متحد رکھنے کے لئے سترھویں صدی کے وسط سے پہلے ان کے پاس کوئی سماجی ڈھانچہ (Social Structure)اور سیاسی شناخت نہ تھا،اور لگتاہے کہ وہ یکے بعد دیگرے گروہوں (Waves)کی صورت میں آئے اوران میں دشتیاری کے جد گال(ایران کے جنوب مشرقی کونے) اور براہوئی (قلات کے جنوب میں) دو قابل ذکر زبانیں بولنے والے گروہوں کے علاوہ موجود لہجوں کا فرق سوال کھڑے کرتی ہے۔ماضی قریب میں بلوچ عام طور پر خانہ بدوش اور ذراعت پیشہ بلوچوں میں فرق کرتے تھے۔خانہ بدوش جنہیں وہ بلوچ کہتے تھے(یعنی حقیقی بلوچ)اورذراعت پیشہ جنہیں وہ شہری کہتے تھے۔بہت سے شہری بلوچ معتبر قبائلی خاندانوں کے ساتھ غلام کسانوں(Helot type) کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ان میں سے اکثر باہر سے آئے ہونگے۔انکا تعلق بلوچی بولنے والوں سے نہ تھا۔اب انکی

شناخت مکمل بلوچ کی ہے۔ ان میں جد گال بھی ہیں (جنکی زبان سندھی کی ایک لہجہ لگتا ہے) اس کے علاوہ غلام بھی تھے جو مشرقی افریقہ سے درآمد کئے گئے۔ بہت سے براہوی بولنے والے حکومت قلات کے قریب تھے، جو 1638 سے 1954 تک مسلسل وجود رکھتی تھی۔ زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ شواہد ہیں ماضی قریب میں ایک سے زائد بار کئی براہوئی لوگ (Communities) براہوئی زبان سے بلوچی زبان بولنے لگے اور اسی طرح بلوچی بولنے والے کچھ لوگوں نے براہوئی زبان بولنی شروع کی۔ مور جستینی (Morgenstierne) بارتھ کا حوالہ دیتے لکھتا ہے کہ بلوچی اور براہوئی بولنے والوں کا قبائلی نظام پٹھانوں کے بر خلاف دوسری نسلوں کے لوگوں کو قبیلے میں جذب (Assimilation) کرنے کے حق (Favours) میں ہے اس میں شک نہیں کہ یہ عمل بلوچ اور براہوئی قبیلوں میں زبان کی تبدیلی کی بار بار وجہ بنی ہو۔

کیونکہ جدید دنیا میں نسلی شناخت کی پہچان عام طور پر نسلی لسانی معنٰی میں ہوتی ہے، قومی شعور کی بیداری سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا براہوئی بولنے والے بلوچی بولنے والوں سے کسی لحاظ سے مختلف ہیں یا نہیں؟ دشتیاری (ایران) کے جد گالی بولنے والوں کے لئے یہ سوال نہیں اٹھا کیونکہ تاریخی لحاظ سے باہو قلات میں انکی حیثیت سردار زئی خانوں کے ماتحت نچلے طبقے کے کسانوں کی رہی ہے، لیکن پاکستان میں براہوئی بولنے والوں کو سارا وان، قلات کے جنوب میں اس قسم کے نا موافق حالات کا سامنا نہیں رہا۔

بلوچی براہوئی زبان اور ثقافت کی ترقی کے لئے دو اکیڈمیز قائم کیے گئے۔ یہ حکومتی مفاد میں ہے کہ وہ براہوئی زبان کو جدا شناخت دیکر ترقی دے تا کہ بلوچستان میں اتفاق (Solidarity) کمزور ہو۔ کوئٹہ ریڈیو سٹیشن بلوچی پروگرام

نشر کرنے کا بڑا اسٹیشن بن گیا جسے افغانستان اور ایران میں بھی سنا جاتا ہے۔(ریڈیو کابل اور ریڈیو زاہدان سے ہفتے میں دس گھنٹے سے بھی کم پروگرام نشر ہوتے ہیں) بلوچ ادیبوں نے بلوچی، انگریزی، اردو میں کتابیں لکھیں۔ 1960 کی دہائی سے بہت سے بلوچ ادیبوں نے بلوچ تاریخ اور ثقافت پر کئی کتابیں لکھیں۔

1978 میں افغانستان میں خلق حکومت بننے کے بعد بلوچی سمیت سات زبانوں کو قومی زبان کا درجہ دیا گیا جن میں دری اور پشتو کے علاوہ ازبکی، ترکمانی، نورستانی اور پاشائی شامل تھے۔ بلوچی کی یہی حیثیت سویت قبضہ اور سول وار کے دوران قائم رہی۔1986 سے نجیب دور میں دری اور پشتو کو اہمیت دی گئی۔ بلوچ اس وقت موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی نسلی لسانی شناخت کو ترقی (Promote) دینے کے لئے تیار نہ تھے۔1996 سے طالبان کے دور میں اگرچہ کوئی لسانی پالیسی کا اعلان نہیں کیا گیا لیکن عملی طور حکومتی زبان پشتو ہی تھی۔ اگلی آئین کا اعلان 2004 میں کو لیشن فورسز نے کیا۔ اس میں بھی سابقہ آئین کی طرح کسی سرکاری زبان کا انتخاب نہیں کیا گیا، باہر حال آرٹیکل 16 میں کہا گیا؛ پشتو، دری، ازبکی، ترکمانی، بلوچی، پاچائی، نورستانی اور پامیری اور ملک میں موجود دوسرے زبانوں میں سے پشتو اور دری ریاست کی سرکاری زبان ہونگی۔ وہ علاقے جہاں لوگوں کی اکثریت ازبکی، ترکمانی، پاچائی، نورستانی، بلوچی، پامیری زبانوں میں سے کوئی ایک زبان بولتی ہو وہ زبان پشتو اور دری کے علاوہ وہاں کی تیسری سرکاری زبان ہو گی۔ اسکا استعمال قانونی لحاظ سے طے کیا جائیگا ریاست موئثر پروگرامز ترتیب دیگی اور انہیں عمل میں لائے گی تاکہ افغانستان کی تمام زبانوں کو ترقی دی جاسکے۔ ملک میں بولی جانے والی تمام زبانوں کی ذرائع ابلاغ اور پرنٹ میڈیا میں استعمال کی اجازت ہو گی۔ ملک میں استعمال ہونے والی ماضی کی علمی اور قومی انتظامی اصطلاحات اور استعمال کو محفوظ کیا جائیگا۔

(Past academic and national administrative terminology and usage in the country shall be preserved.)

ایران کے 1906 کے آئین میں خاص کر بلوچی زبان کی بات نہیں کی گئی۔ آئین کے چیپٹر۔1 آرٹیکل۔15 میں صاف بیان ہے کہ مقامی زبانوں کی میڈیا سمیت استعمال کی اجازت ہے۔

یہ آرٹیکل نسلی ادب(Ethnic Litrature) کا فارسی کے کورسز (Coursis) کے ساتھ ساتھ استعمال کی بھی اجازت دیتی ہے۔ کارینا جہانی کے مطابق "بہر حال انقلاب کے بعد کی بڑی حوصلہ افزا اجرا(Production) کے باوجود اب صرف ریڈیو زاہدان کی روزانہ کی نشریات باقی رہ گئی ہیں۔ الفن بین کے مطابق 1960 کی دہائی میں مرکزی حکومت زاہدان سے روزانہ کئی گھنٹے بلوچی میں خبریں اور موسیقی نشر کرتی تھی۔ کارینا جہانی لکھتی ہیں یہ قابل ذکر ہے کہ 1960 کی دہائی میں ایران کے بلوچ مہاجرین کے ایک چھوٹے سے گروپ کو سویڈن میں بلوچی زبان پڑھائی جاتی تھی۔

پاکستان میں بلوچ نیشنلزم قومی سطح پر ایک سیاسی عنصر ہے۔ ہیریسن کیمطابق کہا جاتا ہے بلوچ نیشنلزم کی ابتدا 1928 سے دوست محمد کی رضا شاہ کے خلاف مزاحمت سے ہوئی۔ لیکن یہ مشکوک ہے کیونکہ 1960 کی دہائی سے قبل بلوچوں میں موئثر حد تک نسلی بیداری، سیاسی اتحاد میں دلچسپی اور ایک مضبوط لیڈرشپ پیدا کرنے کی صلاحیت جو ایک کامیاب قومی تحریک کے لئے لازم ہیں شاید ہی کہیں پائی جاتی ہو۔ اسی وقت سے پاکستان ایران اور خلیج میں کئی بلوچ نوجوان متحرک ہوئے۔ 1981 میں لندن میں بلوچ مہاجرین کے گروپس کا ایک اتحاد "ورلڈ بلوچ آرگنائزیشن (World Baloch Organization)" وجود میں آیا۔ جس کا کام بلوچ 'مقصد' کے حصول لئے پیسے اکھٹا کرنا تھا۔

دنیااور خاصکر پاکستان اور ایران میں تیز سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے بلوچی کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ قبائلی شناخت تیزی سے اپنی اہمیت کھوتی جارہی ہے۔ امکان ہے کہ بلوچی فارسی اور اردو کو اس وقت تک راستہ دے گی جب تک ایک مضبوط نسلی شناخت کی تحریک اپنالیڈر پیدا نہیں کرتا۔ میں 1984 میں اندرون بلوچستان ایک ایسی جگہ میں تھا جہاں بحث مباحثہ میں ایک وقت میں چھ زبانیں بلوچی، براہوئی، انگریزی، پشتو، فارسی اور اردو بولی جارہی تھیں۔ میرے خیال میں بحث میں شریک صرف میں ہی تھا جو اسکی اہمیت کو جان گیا تھا۔ دویا کئی زبانیں بولنا بلوچستان اور اسکے آس پاس عام ہے۔ اس بحث میں شریک کوئی بھی شاید ان چھ زبانوں کو روانی سے نہیں بول سکتا تھالیکن انہیں مقامی زبانیں تسلیم کیا گیااور ہر شخص ان زبانوں سے مطمئن تھا۔ گفتگو میں شریک افراد میں ہر ایک کی سماجی حیثیت مختلف تھی جسکا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ایک نسل قبل سماجی حیثیت شاید زبان کے انتخاب کو کم متاثر کرتا ہو۔ مباحثہ میں شریک ہر ایک سینئیرٹی(Seniority) کے مضمرات کو جانتا تھااور یہ بھی کہ کون سینئر (Senior) ہے اور سینئر مباحثہ اپنی پسند کی زبان میں رواں رکھتا تھا۔ عام طور پر بلوچ سماج اسی طرح چلتا ہے۔ 1980 کی دہائی کے آخر تک بہر حال سماجی رتبوں نے اپنی کچھ برتری کھودی۔ لوگ سماجی طور دن بدن زیادہ متحرک ہوتے جارہے ہیں، جسے مختلف سماجی پس منظر رکھنے والے لوگوں کی آپسی کاروبار سے دیکھا جاسکتا ہے۔ بلوچ سندھ اور جنوبی پنجاب میں بلوچی، سندھی، پنجابی اور سرائیکی چار زبانیں بول سکتے ہیں۔ کراچی میں اکثر بلوچ سندھی اور اردو روانی سے بولتے ہیں۔ وہ مواقع(Situations) جہاں بلوچی بولنا ضروری(Important) ہو کم ہوتے جارہے ہیں۔

کونسی زبان؟

(Zubeida Mustafa)

اسکول میں کس زبان میں تعلیم دی جائی، یہ موضوع ایک بار پھر زیر بحث ہے۔ اس لئے کہ اس مسئلے کو کبھی حل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مادری زبانوں کے حق میں لابی(Lobby) نے زور پکڑلیا۔ اب اس لابی کی بات سنی جا رہی ہے۔ مادری زبانوں کے مسئلے نے جو مقبولیت حاصل کی اب اسے دبایا نہیں جا سکتا۔ اس بار کس نے اس تنازعہ کو جنم دیا؟ اس بار یہ تنازعہ قومی نصاب تعلیم کونسل کے سب کمیٹی

(Sub-Commttee of National Curriculum Council)

کی رپورٹ نے جنم دیا، جو اس نے تعلیمی زبان کے بارے دی۔ بعد میں اس رپورٹ کو NCC نے غلط رپورٹنگ(Misreporting) کا حصہ کہہ دیا۔ این سی سی کی اس نام نہاد رپورٹ میں کئی مضامین کی پرائمری سے بارھویں جماعت تک انگریزی میں پڑھنے کی تجویز دی گئی اور مقامی(قومی) زبانوں کو مکمل طور پر نظر انداز (Ignore) کیا گیا تھا۔ یہ مقامی زبانوں کو نظر انداز کرنے کی وجہ تھی کہ سوشل میڈیا پر کانوں کو بہرہ کر دینے والی شور اٹھی، جو ہونی بھی چاہیئے تھی۔ بعد میں مجبوراً حکومت نے نیا اعلانیہ جاری کیا اور بتایا گیا کہ تعلیمی زبان کا مسئلہ صوبوں پر چھوڑ دیا گیا۔ جو بھی ہو !اس سے کوئی مطمئن نہیں ہو گا کیونکہ ماسوائے سندھ کے دوسرے صوبے شعبہ تعلیم سے متعلق اپنے ان حقوق سے (جو انہیں اٹھارویں ترمیم کے بعد ملے تھے) مرکز کے حق میں دست بردار ہو گئے۔ تعلیم کو انگریزی بنانا اور مرکز کے حوالے کرنے کی "پی ٹی آئی" کے موقف سے ہر کوئی

واقف ہے۔میں سب کمیٹی اور NCC کے نوٹس میں یہ بات لاناچاہتی ہوں کہ صرف صوبائی زبانوں کو پڑھانے کا مسئلہ خطرے میں نہیں بلکہ بنیادی سوال مادری زبانوں میں تمام مضا مین جن میں سائنس بھی شامل ہو پرائمر تک پڑھانے کا ہے۔انگریزی ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھانا اچھاہے لیکن اسے تعلیمی زبان (Medium of Instruction)قرار دینا سراسر غلط (Ridiculous) ہے۔دنیا میں تعلیمی ماہرین نے ''مادری زبان میں تعلیم'' کے حق میں مدلل اور بھرپور دلائل دیئے اور مکمل حمایت کی ، میں یہاں انہیں مختصراً دوبارہ بیان کرونگی۔

بچہ مادری زبان قدرتی طور پر پہلے گھر کے ماحول سے اور تھوڑی دیر بعد برادری(Community) سے حاصل (Acquire)کرتا ہے۔بچے کو یہ زبان پڑھنی نہیں پڑتی۔جوں جوں بچے کے " ادراک "کی نشونما حیاتیاتی ماحول میں پروان چڑھتی ہے وہ اس زبان کا انتخاب خود بخود کرتا ہے۔

(Which he picks up himself as his cognitive development takes place symbiotically)

یہ عمل پیدائش کے فوراً بعد شروع ہوکر 6-7 سال تک جاری رہتا ہے۔اس دوران بچہ اپنے آپ تعلیم(Self Education) کے عمل سے سیکھ رہاہوتا ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ماہر تعلیم(Educationists) یہ بات نہیں سمجھتے۔ہمارے ہاں جوں ہی بچہ دو سے پانچ سال کی عمر میں کہیں بھی اسکول میں داخل ہوتا ہے خود سیکھنے کے گزشتہ تجربے کو نالے میں پھینک دیا جاتا ہے اور اسکی مادری زبان جس میں وہ اب مہارت حاصل کر چکا ہوتا ہے، پر مضبوط ڈھکنا تڑاک سے لگادیا جاتا ہے۔اس طرح بچے کو بتادیا جاتا ہے اگر وہ حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ ہوناچاہتا ہے

تولازمی اسے ایک بالکل اجنبی زبان میں پڑھنا ہوگا (پاکستان میں ٪90 بچوں کے لئے اردو ایک اجنبی زبان ہے۔)

پھر کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے بچہ سکول اور تعلیم میں دلچسپی لینی چھوڑ دیتا ہے۔ پھر اسے ارد گرد کے لوگوں سے بیگانہ کیا جاتا ہے جیسے اساتذہ اور دوسرے بچے جنہیں اسکی زبان بولنے کی اجازت نہیں دی جاتی اگروہ اسکی زبان جانتے بھی ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی زبان بھولنا شروع کر دیتا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ سوچنے کی استعداد کھو بیٹھتا ہے، مزید یہ کہ وہ اس نئ اور اجنبی زبان جسے نئے اور اجنبی لوگ اسے پڑھارہے ہوتے ہیں میں مہارت بھی حاصل نہیں کرپاتا۔ یہ سلوک اسے۔"بے زبان" بناتا ہے۔ جیسے وہ گونگا(Dumb) ہو، اور ایک رٹاکو (Rote) پڑھنے والا۔ یہ رویہ اس سوال کا جواب ہے کہ ہمارے بچے ایسے اسکولوں میں جہاں مناسب حد تک اچھی تعلیم دی جاتی ہے پڑھنے میں کیوں ناکام(Fail to learn) ہوتے ہیں۔

اب ان تین لڑکوں کی مثال لی جیئے جنہیں میں آجکل پڑھارہی ہوں۔ جنکی عمریں 11 سے 13 سال ہیں اور فرض کریں وہ انگریزی میں پڑھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا میں آپ سے کس زبان میں بات کروں، "انگریزی میں" سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ "ہاں" مزید کہا "ہم چاہتے ہیں ہماری انگریزی بہتر ہو"۔ جب میں نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا پتھر نکالا اور انکے سامنے رکھا، جو میں 1990 میں جرمنی سے لائی تھی، جب میں وہاں گئی، اس وقت تک برلن دیوار کی باقیات وہاں بکھرے پڑے تھے۔ پتھر کو دیکھ کر میرے شاگرد تجسس میں پڑ گئے۔ جب میں نے انگریزی میں اس پتھر کے پس پردہ تاریخ بیان کرنی شروع کی تو بچوں نے بلند آواز میں احتجاج کیا اور اردو میں بات کرنے کو کہا۔ اب وہ اردو

میں اس بات چیت سے لطف اندوز ہو رہے تھے کیونکہ وہ میری بات صاف سمجھ رہے تھے۔اس کے علاوہ وہ آسانی سے اپنی سوچ کو ترتیب (Articulate) دے سکتے تھے۔ جسکی میں ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتی ہوں کہ وہ کریں۔کلاس کے اختتام پر وہ دوسری جنگ عظیم کی تاریخ برجستہ اور مزاحیہ انداز میں مختصر بیان کر رہے تھے۔

یہ ہے زبان کی جادو۔زبان لوگوں کو آپس میں جوڑنے کا ایک اہم عنصر ہے۔یہ اساتذہ اور طلبا کو منسلک کرتی ہے۔جو یہ کہتے ہیں زبان سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ٹیچر اچھا ہونا چاہیے ،وہ صحیح نہیں کہتے۔طالب علم کی زبان ٹیچر کو لازمی آنی چاہیئے۔جو ٹیچر یہ سادہ حقیقت نہیں سمجھتا وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ تعلیم لازمی شراکتی (Participatory)ہو،تاکہ تعلیم سے بچے لطف اندوز ہوں۔

زبان

اقتدار کی جدوجہد میں ایک خفیہ طاقت

(مشتاق صوفی)

مجاز حلقے بار بار اسکا اعادہ کرتے ہیں کہ مادری زبان اپنے بولنے والوں کو ایک منفرد اور مخصوص شناخت سے نوازتی ہے۔یہ حقیقت ہے کہ زبان ایک طاقت ہے۔مادری زبان اپنے بولنے والوں کو انکے موقف کے جامع اظہار اور گفتار میں روانی کی بے پناہ قوت عطا کرتی ہے۔دوسری جانب یہ گروپوں اور قوموں کے مابین اقتدار کی تقسیم کے گفت وشنید میں ایک خفیہ طاقت ہے۔زبان غلبہ پانے اور محکوم رکھنے دونوں کا ذمہ دار ہے۔غلبہ خفیہ طور پر کمزور گروپوں کی سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی پہلوؤں کو گھیر لیتی ہے۔اسطرح کمزوروں کے حصے میں قناعت اور جمود (Status-Quo) ہے۔اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک زبان دوسری زبان کو 'غیر' کہنے پر تیار بیٹھی ہے۔مزید یہ کہ زبان بالادست کلچر کی زیردست کلچر پر قبضہ کی خواہش کو قوت بخشتی ہے۔اسکا مطلب محکوم قوم پر قبضہ کر کے اسے ختم کرنا ہے اگر محکوم قوم اسے کچلنے کی طاقت نہیں رکھتی ہو۔یہ کام حاکم قوم کی طرز زندگی کو محکوم پر مسلط کر کے ہی عمل میں لایا جاتا ہے۔گو کہ اعلانیہ یہ نہیں کہا جاتا لیکن حقیقت میں ہوتا یہی ہے۔کہا یہ جاتا ہے کہ یہ کام بڑے مقاصد، جیسے ثقافتی ترقی، سماجی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور یکسانیت کے لئے کیا جارہا ہے۔اسطرح کے منصوبے خول (Shell) کا کام کرتے ہیں اور حقیقت (Kernel) کو چھپاتے ہیں۔مختلف گروہوں میں زبان کی سیاست عام طور پر صرف زبان تک محدود نہیں ہوتی بلکہ یہ

کثیر جہتی رجحان کا احاطہ کرتی ہے۔زبان اپنے اندر اقتدار کی جنگ (جو کئی انداز میں لڑی جاتی ہے) کو چھپاتی ہے۔ہم یہاں ماضی قریب کے چند واقعات کا جائزہ لیں گے، جو تھے تو اقتدار کے لئے لیکن سامنے زبان کا مسلہ تھا۔برصغیر پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے مقامی زبانوں میں سے اردو کو چن لیاجو اتر پر دیش کے شہری مراکز کی زبان تھی۔اسکے علاوہ یہ مغل دربار میں فارسی (جو خود ایرانی سامراجی کلچر کی نشانی تھی) کے ساتھ بھی رائج تھی۔اردو کی سرپرستی دہلی اور لکھنو کے حکمران اشرافیہ نے کی جنکی اکثریت باہر سے آئے مسلمانوں، زیادہ تر سنٹرل ایشیا، ایران اور عرب سے تھی۔یہ مراعات یافتہ لوگ مقامی اخلاقیات (Ethoes) سے منحرف تھے۔اگرچہ یہ طبقہ ایک چھوٹی سی اقلیت تھی لیکن ان کے ہاتھ میں سیاسی وعسکری(Politico-Military) طاقت تھی۔اس لئے وہ بلاشرکت غیر مراعات کا لطف اٹھاتے تھے۔انگریزوں نے تاریخی جبر کے تحت طاقت کے وہی ثقافتی اوزار استعمال کئے جو انہیں سابقہ مغل ڈھانچہ سے وراثت میں ملے۔اسطرح انہوں نے اردو کو برصغیر میں رابطے کے زبان(langua-franca) کے طور پر فروغ دیا۔وہ آسان سمجھ کر (Conveniently) یہ بھول گئے کہ کوئی بھی ایک زبان کئی زبانیں بولنے والے برصغیر کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔انیسویں صدی میں انہوں نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں، 'اردو ترقی پروجیکٹ' شروع کی۔ہندو دانشور (جو خود بھی اردو سے ملتی جلتی 'ہندی زبان') بولتے تھے، نے اسی صدی کی آخری تین دہائیوں میں بالا دستی کو فروغ دینی والی اس پروجیکٹ کے خلاف رد عمل دکھایا۔اس سے اردو، ہندی تصادم نے جنم لیااور یہ بیسویں صدی کے تیسری دہائی میں عروج کو پہنچا، جب اردو کے حمایتیوں نے مسلمانوں سے کہا (اور ان سے بھی جن کے زبان اردو نہ تھی) کہ مردم شماری میں وہ اردو کو اپنی مادری زبان

لکھائیں۔ جبکہ ہندی زبان کے حمایتیوں نے اسی طرح ہندوؤں سے ہندی زبان کو اپنی مادری زبان بتانے کی مہم چلائی۔ اردو اور ہندی کے ہمدرد دیدہ دلیری سے جھوٹ پر جھوٹ بولتے رہے تاکہ حقیقی تضاد کو چھپا سکیں جس سے ہندوستان پر صدیوں کی مسلمان حکمرانی نے جنم لی۔ یہ اقتدار کی چپکلش کی جانب اشارہ تھا، جب برطانوی دور میں کھیل کا میدان تاریخی لحاظ سے محروم ہندو اکثریت اور بالادست مسلم اقلیت کے مابین کسی قدر برابر ہوا تھا۔ اقتدار کی خاطر یہ پہلا وسیع تصادم زبان کے جھگڑے کی صورت سامنے آیا۔ اس تصادم میں فریقین نے ایک اور حقیقت چھپادی وہ یہ کہ زبان کی جڑیں عقیدے کی بجائے زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ اردو اسلامی نہیں اور نہ ہندی ہندو ہے۔ کئی ہندو خاندان اردو بولتے ہیں اوراسی طرح کئی مسلمان، جینز اور بدھ اسٹ ہندوستان میں ہندی بولتے ہیں۔ اسطرح دونوں زبانوں کو کئی عقیدوں کے لوگ بولتے ہیں۔ زبان کا تصادم حقیقت میں ہندو، مسلم کے مابین اس کھائی کو بیان کرتی ہے جسے وہ پاٹنے میں ناکام رہے۔ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے دونوں فریقوں نے زبان کو علامت کے طور پر استعمال کیا۔ یہ پریشان کن ہے کہ ہندو مسلم تضاد نے اگرچہ مسلمانوں کے لئے الگ ملک پاکستان وجود میں لاکر حل نکالنے کی کوشش کی لیکن زبان کا تصادم اقتدار کی لڑائی کی خاطر ختم نہ ہو سکا۔ اب یہ دو فرقوں کی بجائے ایک فرقہ کے مابین سامنے آیا۔ پہلے یہ تصادم ہندو اور مسلم کے درمیان تھا اب یہ بدل کر بنگالی اور غیر بنگالی مسلمان کے مابین شروع ہوا۔ غیر بنگالی اقلیت میں تھے لیکن بالادست تھے۔ ان میں اترپردیش، پنجاب اور موجودہ خیبر پختونخوا سے آئے لوگ شامل تھے، جو تحریک پاکستان میں آگے آگے تھے۔ انہوں نے بنگال (مشرقی پاکستان) میں بنگالیوں کی بجائے پاور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ گو کہ بنگالیوں نے تحریک پاکستان

میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا۔ یہاں پر بھی مغربی پاکستان سے آئے اشرافیہ ٹولے نے زبان کو سیاسی مہم کے طور پر استعمال کیا تا کہ وہ اپنی بالا دستی قائم رکھ سکیں۔ اس مسئلے پر بانی پاکستان محمد علی جناح (جو کوئی بھی مقامی زبان نہیں جانتے تھے ماسوائے اپنی مادری زبان گجراتی کے) کو انکے اتر پر دیش کے مہاجر مشیروں نے غلط مشورے دیئے۔ انہوں نے 1948 میں ڈھاکہ جا کر پرزور انداز میں اعلان کیا کہ ''اردو اور صرف اردو، پاکستان کی واحد قومی زبان ہو گی''۔

اس اعلان سے بنگالی اکثریت کی عزت نفس مجروح ہوئی اور فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ بنگالیوں (جو سیاسی لحاظ سے بیدار تھے) نے اس اعلان کو غلبے کی سنسناہٹ (Simmering attempt at domination) جانا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس آزادی سے صرف انکے آقا تبدیل ہوں گے، گوروں کی جگہ بھورے جاگیر دار، سول اور ملٹری بیوروکریٹس لیں گے۔ موجودہ حکمران ان کے لئے اتنے یا اس سے زیادہ اجنبی تھے جتنے سابقہ حکمران تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ نعروں کی سیاست جیسے قومی یکجہتی، قومی سالمیت محکومی کے اوزار (Tool) ہیں۔

جناح کو جس بات نے ایک چھوٹی مہاجر اقلیت کی زبان کی حمایت کرنے پر آمادہ کیا وہ ایک سیاسی فیصلہ تھا اور اسکا تعلق زبان سے زیادہ اقتدار سے تھا۔ پاکستان جس بیانیے پر وجود میں آیا کہ ''مسلمان ایک الگ قوم ہیں'' اس معاملے میں یہ بات منطقی تھی کہ بنیادی اہمیت اسی عنصر کو دی جائے جو اس بیانیے کو سہارا دے سکے۔ یعنی مسلمان ثقافتی محور (Arboratum of muslim culture) جسے اتر پر دیش کے اجنبی مسلمان اشرافیہ نے اپنے اقتدار کے ارد گرد بچھار کھا تھا۔ بنگال کے بارے انکا خیال تھا کہ وہ اس نام نہاد ثقافتی مرکز (Cultural main land) سے دور ہے۔ انکا خیال تھا کہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تو ہے لیکن وہ

زبان، فن اور پکوان سے لیکر مختلف ہندوثقافتی اثرات سے گڈ مڈ (Melange) ہیں۔ اترپردیش اور پنجاب کے حکمران ٹولے کو تشویش تھی کہ بنگالی سماج ایسے نظریاتی تصور کا وفادار نہیں ہوگااور انہیں خوف تھا کہ جو مسلم خصوصیت (Muslim exclusivity) کا تصور انہوں نے بن رکھاہے بنگالی اسے رد کریں گے۔ بنگالی مسلمان ہونے کے باوجود اپنے مقامی طرز زندگی پر فخر محسوس کرتے تھے۔ جناح کا اعلان بالکل غیر ضروری تھا۔ اس نے پاکستان بننے کے بعد زمینی حقائق کو مد نظر نہیں رکھااور اس کے اعلان نے نومولود ریاست کو ایک بڑے خطرے سے دوچار کیا۔ تقسیم سے قبل مسلم قومیت کا تصور مثالی تھا جس نے تحریک کو چلائے رکھا۔ لیکن تقسیم کے بعد زمینی حقائق ہی حقیقی سیاست کا تعین کر سکتے تھے۔ اگر صاف ذہن سے دیکھا جائے، یہ علاقے جن سے ملکر پاکستان بنا، تاریخی ارتقائی اکائیاں ہیں۔ ہر اکائی کا ایک مخصوص اور جدا ثقافت اور زبان ہے۔ اگرچہ عقیدہ اہم ہے لیکن متحد کرنے والی واحد کڑی نہیں ہے۔ مشترکہ عقیدے پر زیادہ زور دینا لازمی رد عمل دکھاتا ہے اوروہ رد عمل بہت تکلیف دہ ثابت ہوئی تھی۔ ہماری لیڈرشپ تاریخی حقائق کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں ناکام ہوئی اور اسکی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ جب مغربی پاکستان کی ریاستی طاقت کے بے رحمانہ اقدامات کے باوجود بنگال میں زبان کی تحریک ختم نہ ہو سکی تو 1954 میں بنگالی زبان کو اردو کے ساتھ قومی زبان تسلیم کیا گیا۔ یہ بنگالیوں کے لئے ایک بڑی کامیابی تھی۔ جو دونوں بازوؤں کے مابین اقتدار کی توازن کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ اقتدار میں شرکت کا مسئلہ (جسکا اظہار زبان کے تصادم سے کیا جارہا تھا) آخر کار بنگلہ دیش بننے پر منتج ہوا۔ لیکن خانہ جنگی کے نتیجہ میں بہت بڑی جانی اور مالی تباہی ہوئی۔ اسے ہم دوسری تقسیم کہہ سکتے ہیں، جو ویسی ہی خونی اور گھناؤنا تھی جیسے کہ پہلی تقسیم۔ زبان کے تصادم کی ایک اور مثال ترکی کی ہے جو اپنی بے قابو سامراجی تسلسل

(Uncontrollable imperialistic streak) سے کرد اقلیت پر ظلم ڈھا رہی ہے۔ ترکی نے 1980 میں کردی زبان پر عوامی اور نجی زندگی میں پابندی لگا کر کھلے عام اپنی غرور کا ظالمانہ مظاہرہ کیا اور کردی زبان بولنا، لکھنا جرم قرار دیا۔ وہ لوگ جو ہمت کر کے کردی بولتے، لکھتے یا گاتے، انہیں جیل بھیج دیا جاتا۔ کردوں پر اس ظلم کا حقیقی مقصد ترک طاقت کا مظاہرہ تھا۔ تاکہ بہادر کردوں کے حوصلے پست کئے جاسکیں۔ جنہوں نے ترکوں کی یکسانیت (Monolith) کو ماننے سے انکار کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ زبان اقتدار کے سیاست کی نمائندہ (Proxy) ہے۔ ایک گروہ کی دوسرے گروہ پر بالادستی کی خواہش یا ایک گروہ کی دوسرے گروہ کی بالادستی کے خلاف مزاحمت، دونوں کے لئے زبان ایک آلہ (Tool) کی طرح کام کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں زبان ایک نہ ختم ہونے والے غلبے کے خلاف کمزور کے لئے ایک ہتھیار ہے۔ غلبہ کے دو اہم سیاسی اور ثقافتی پہلو ہیں۔ انتونیو گرامچی اٹلی کے ایک قابل ذکر مفکر اور نظریہ ساز تھے۔ انہوں نے اپنے مشہور ''ثقافتی تسلط'' کے نظریئے کا جیل سے اعلان کیا اور بتایا کہ کیسے حکمران اشرافیہ، اقدار، سماجی عادات اور کئی اور کا استعمال کر کے دنیا کے بارے اپنی سوچ کا صحیح تاثر دیکر محکوم لوگوں پر اپنی بالادستی قائم رکھتی ہے۔ اسطرح کی ثقافتی برتری حکمران طبقے کی اپنی بنائی گئی اقتدار کے ڈھانچے پر اسکی مجموعی برتری کو ظاہر کرتی ہے۔ پاکستان میں تسلط اور سیاسی طاقت کا کھیل ثقافتی بالادستی کے ذریعے پنجابی اشرافیہ کھیل رہی ہے۔ لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ وہ ایک مستعار ثقافتی نقاب پہن کر یہ کھیل کھیل رہی ہے اور نا سمجھی میں اسے اپنا چہرہ کہتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ اپنی زیادہ آبادی اور ریاستی اداروں میں اکثریت کے سبب اقتدار پر مکمل قابض ہو گیا ہے۔ اس نے مہاجر برتری کی جگہ بھی سنبھال لی۔ اس میں اسے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ کیونکہ اس نے پہلے سے اتر پردیش کی زبان اور ثقافت اپنالی

تھی جسے برطانوی سامراج نے 1849 میں پنجاب پر قبضہ کے بعد مسلط کیا تھا۔ اردو زبان مسلط کرنے کے بعد پنجاب اپنی زبان، کلچر اور تاریخ سے جدا (Disconnect) ہو گیا تھا۔ نو آبادیاتی ڈھانچہ نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پنجاب میں اس بڑھتی بیگانگی کا فائدہ اٹھایا۔ لیکن تحریک پاکستان اور ریاست کے وجود میں آنے کے بعد یہ بیگانگی ایک نئے اوزار (Tool) میں بدل گئی۔ اس نے مابعد نو آبادیاتی ریاست (Post-colonial state) اور سامراج ایجنٹ اشرافیہ (Comprador elite) کے مفادات کی خدمت، عقیدہ اور قومی سالمیت کے نام پر کرنا شروع کی۔ بہر حال ملکی سیاسی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ایک شاندار لیکن غلط آغاز ثابت ہوا۔

کئی وجوہات کی بنا ان عوامل کا مکمل تجزیہ نہ کیا جا سکا۔ پنجابی حکمران ٹولہ نوشتہ دیوار نہ دیکھ پائی۔ وہ ثقافتی قوم دوستی کے بھیس میں طاقت کا کھیل سامنے لائی۔ جسکا مقصد یکسانیت (Homogeniety) قائم کرنا تھا۔ جو حقیقت میں اردو آئیزیشن یا یوپی آئیزیشن (Urduization or UP- ization) ہی ہے۔ اس کے خلاف دوسری قومیتوں نے جب رد عمل دکھایا تو وہ اپنی ناسمجھی کی بنا حیران ہوا۔ پنجابی اشرافیہ کا منطق ہے کہ انہوں نے پاکستان کی خاطر اپنی زبان اور ثقافت چھوڑ دی دوسرے ایسا کیوں نہیں کرتے؟ مخالفین کا موقف ہے کہ پاکستان ہماری زبان اور ثقافت کے تحفظ اور ترقی کے لئے وجود میں آیا نہ کہ انکی تباہی کے لئے۔ دوسری قومیتوں کا کہنا ہے کہ پنجابی حکمران پاکستان کے علاقوں کی تاریخی تنوع (Diversity) کو تسلیم کریں۔ تنوع کو رد کرنا اختلافات کو جنم دیگی جو کمزور ریاست پر ناقابل برداشت بوجھ ڈالے گی۔

زبان کی سیاست وسیع تناظر میں اقتدار کے کھیل کا ایک گندا پیغام ہے۔ طاقت کا استعمال اگر ماسوائے طاقت کے کی جائے پھر بھی وہ طاقت کی اصلیت

(Nature of power)کو کم نہیں کرتی۔اسطرح کی طاقت یقینی طور پر زیادہ گمراہ یا کجرو (Deceptive or deflective)بن جاتی ہے۔زبان کی سیاست کا معروضی مطالعہ اور تجزیہ کے لئے ہمیں اسے طاقت کے وسیع ڈھانچہ میں دیکھنا چاہیے۔جس کے ساتھ وہ نامیاتی طور پر منسلک ہے۔ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ طاقت کے رشتے جو طاقت کے سانچے ہی سے بر آمد ہوتے ہیں متعلقہ ہر ایک کے عمل کو بیان کرتے اور تعین کرتے ہیں۔زبان کا مسئلہ زبان سے زیادہ ہے۔جیسا کہ تھارسٹین وَیبلن (Thorstein Veblen)اپنی کتاب "بالائی طبقہ کا نظریہ" (The Theory of the Leisure Class)میں ہمیں بتاتا ہے۔بالائی طبقے کے شریف آدمی کی چھڑی چلنے میں مدد دینے سے زیادہ اسکی طاقت کا مظہر ہے۔

(An upper class gentlemans walking stick is more than an aid of walking;it exhibits his power.)

اور یہی حال زبان کا ہے زبان بات کرنے سے زیادہ طاقت کی سیاست کا اظہار کرتی ہے۔

(روزنامہ "ڈان")

22-27دسمبر 2021

مسائل کا صحیح حل

(زبیدہ مصطفیٰ)

ملک میں "واحد قومی نصاب (Single National Curriculum)" کے فیصلے نے تعلیمی زبان کی بحث پر اہل الرائے (Intelligentia) کو اپنے گرفت میں لے لیا۔ مختلف نقطہ نظر رکھنے والوں کے مابین اختلافات اتنی شدید ہیں کہ بامقصد مکالمہ ممکن نہیں رہا۔ ایک سازش کے تحت انگریزی زبان کے حامیوں نے کچھ مسائل کو ایسا بگاڑا کہ انکا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان مسائل کی وضاحت کے لئے یہ ایک اور کوشش ہے۔ پہلے اسکی وضاحت ہونی چاہیئے کہ بحث یہ نہیں ہے کہ بچے کسی مقامی زبان میں یا انگریزی میں تعلیم حاصل کریں جو مقامی زبان میں تدریس کے حق میں ہیں، وہ ہمیشہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انگریزی غیر ملکی زبان کی حیثیت سے لازمی بچوں کو پڑھانی چاہیئے۔ مجھے یہ کھوج لگانی ہے کہ ہم پر یہ الزام کیوں لگایا جاتا ہے کہ ہم انگریزی زبان کو تعلیمی نظام سے ہٹاکے اپنے بچوں کو پسماندہ اور انہیں ٹیکنالوجی (Technology) کے استعمال کی قابلیت سے محروم کرنا چاہتے ہیں؟ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے اگر ہم صحیح انگریزی پڑھانے میں ناکام بھی ہوں تو بھی قابل قبول ہے کہ ہم صرف انگریزی اور انگریزی منترا (Mantra) سے چپٹے رہیں۔ انگریزی کے حامی یہ بھی دلیل دیتے ہیں کہ اگر بچہ اپنی تعلیم چار مقامی زبانوں میں سے ایک میں شروع کرے گا تو اسکی تعلیم بند گلی میں پھنس جائے گی۔ اس کے بعد وہ کبھی انگریزی سیکھ نہیں پائے گا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے یہ ملک بیوقوفوں کا نہیں۔ گزشتہ نسل کے تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے اپنی پرائمری تعلیم کسی مقامی زبان میں شروع کی جن میں ہمارے واحد سائنس کے نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام بھی شامل ہیں۔

میرا موقف کئی اور لوگوں کی طرح سادہ ہے۔جب بچہ سکول میں داخل ہو،اسے وہی تعلیم جاری رکھنے دی جائے جو اس نے اپنے کٹیا (Cot)میں ماں کی زبان یا ماحول کے زبان میں شروع کی اور جسکے ساتھ اسکی جان پہچان پہلے سے ہے۔چند سال بعد وہ اردو جو کہ وسیع رابطے کی زبان ہے پڑھنا شروع کرے گا۔ غیر ملکی زبان کی حیثیت سے انگریزی اسکے بعد متعارف ہونی چاہیئے۔یہ زبان کی سیڑھی ہے اس پر بحث کی ضرورت ہے۔سیڑھی سے مراد یہ ہے کہ ہمیں کون سی زبان کب اور کیسے متعارف کرنی چاہیئے۔مثلاً اگر انگریزی زبان بچے کومادری زبان پر عبور حاصل کرنے سے پہلے متعارف کی جاتی ہے تو وہ بچہ گونگا ہو گا۔ دوسرے لفظوں میں وہ کوئی زبان نہیں سیکھ پائیگااور اسکی دوسروں تک رسائی بے ربط ہو گی۔(Communicate Coherently)پاکستان میں لسانی ماہرین عام طور پر سماجی لسانیات(Socio-linguistics)پڑھتے ہیں وہ زبان کے حصول(Language Acquisition) کے لئے نفسیات اور اعضا (Psycology/Anatomy)کا مطالع نہیں کرتے۔جو ایک قدرتی عمل ہے۔

ڈاکٹر مایہ مون ٹسوری(جو اٹلی کی ایک فزیشن، ماہر نفسیات اور ماہر تعلیم تھیں)نے زبان کے عضو (Language Organ)کے بارے 100 سال پہلے لکھا تھا۔نوم چومسکی اب اپنے یونیورسل گرائمر تھیوری سے پیچھے ہٹ کر اس بارے بات کررہے ہیں۔عضو (Organ) بات کرنے(Speech)سننے (Hearing Mechanism)اور"بروکا سنٹر (Broca's Centre) "پر مشتمل ہے۔(بروکا ایک ڈاکٹر تھا جس نے یہ سینٹر دریافت کیا)۔بروکا سینٹر دماغ میں ہے، یہاں عقل کی ساخت (Comprehension)ہوتی ہے۔یہ تینوں بچے کی پیدائش سے ہی باہم مربوط(Coordination) نشونماپاتے ہیں اور ایک

خاص ترتیب اختیار(Fallow a Particular Pattern) کرتے ہیں۔'یہ ماں کی فطری صفت ہے'۔(This is Mother Natural's Way)اس عضو سے چھیڑ چھاڑ(Tempering) کی ہماری کوششیں شیر خوار بچے کو بیٹھنے سے پہلے چلانے کی کوشش کے مترادف ہیں۔ یہاں تک کہ لارڈ بے.بنگٹن میکالے نے بھی اپنی لامحدود دانش کے باوجود یہ معجزہ سرانجام دینے کی کوشش نہیں کی۔ بھورے صاحبوں کی سوچ بھی انگریزی سیکھنے کے لئے ثانوی سطح سے شروع ہوئی

(The Brown sahibs the envisaged began their English learning at the secondary level.)

زبان کے ایڈیاز(Language Ideas) کو نہ سمجھنے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟اسے دیکھنے کے لئے ایک کم آمدنی والے علاقے میں نام نہاد انگریزی میڈیم سکول کے کلاس روم میں جاکر دیکھیں۔ وہاں دوغلی زبان(Hybrid Language) کا استعمال دیکھ کر آپ حیران ہونگے۔ کتابیں انگریزی میں ہیں لیکن اس زبان میں اساتذہ کی قابلیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ کتابیں ٹوٹی انگلش میں پڑھتے ہیں۔ پھر اردو میں سمجھاتے ہیں۔ بورڈ پر انگریزی میں سوال لکھتے ہیں پھر جواب اسی کتاب سے نقل کر کے لکھتے ہیں یہ عمل کسی بھی صورت تعلیم کے لئے قابل قبول نہیں۔ بچے جو بھی بورڈ سے نقل کرتے ہیں ،اسے محنت سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن اسے سمجھ نہیں پاتے۔ یہ رٹے (Rote) کی ثقافت ہے جو زندگی بھر ان کے ساتھ چلتی ہے۔

کیونکہ اساتذہ انگریزی نہیں جانتے اس لئے کوئی بہتری دکھائی نہیں دیتی۔ تعلیم کا یہ طریقہ کار بچوں کو زندگی بھر دل برداشتہ کرتا ہے۔ زبان کی یہ دوغلی نظام ایک اور گھات لگائے برائی(Incidious Evil) کی پرورش کر رہی ہوتی ہے۔ جب بچہ ایک ناواقف زبان سیکھنے کی جدوجہد کر رہا ہوتا ہے اسی عمر میں

اسکا ذہن (Mind) بتدریج بڑھ رہا ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ عقل کی نشونما (Cognitive Development) بھی ہورہی ہوتی ہے۔ذہنی نشونما اور انگریزی سیکھنے کی کوشش کے مابین کشمکش(Struggle) کے نتیجہ میں بچہ دقیق سوچ(Critical Thinking)اورربط سے لکھائی (Coherent Writing)سیکھ نہیں پاتا۔یہ مظہر (Phenomenon)اشرافیہ کے پرائیویٹ انگلش میڈیم سکولوں کے بچوں میں بھی موجود ہے۔لیکن اس کمزوری کو ان سکولوں میں معلم کی صلاحیتوں پر اعتماداور بکثرت ٹیوشن پڑھنے کا عمل چھپا (Mask)لیتی ہے۔اس نقصان کا کوئی مداوا نہیں (Irripairable)ہے۔

آخر میں پرائیویٹ انگلش میڈیم سکولوں کے منتظمین(جو رجحان ساز (Trendsetterہیں) سے ایک اپیل:

آپکی اخلاقی اور قومی ذمہ داری ہے کہ آپ عوام کی اکثریت کے لئے جو بہتر ہے اسکاضرور سوچیں۔

حقیقت میں یہ حکومت ہی ہے جو غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے۔حکومتی اور سستے پرائیویٹ سکولوں میں تعلیمی پستی کی وجہ بدعنوانی، بدانتظامی اور محدود تعلیمی وسائل (Learning Tools) ہیں جن میں تدریسی زبان بھی شامل ہے۔نظام میں اصلاح(Reform)کی ضرورت ہے جو صرف حکومت ہی کر سکتی ہے۔زبان کے مسئلے کو حل کیئے بغیر دوسرے اصلاحات حقیقی اور مربوط نہیں ہونگے اور کام نہیں کریں گے۔لیکن بد قسمتی سے ملک میں "واحد قومی نصاب" تعلیم کے حامی حقیقی مسائل سے توجہ ہٹارہے ہیں۔

(روزنامہ "ڈان")